جلد ۱۲ شمارہ ۱۱ نومبر ۲۰۰۰ء شعبان ۱۴۲۱ھ

فہرست

شذرات

"قائداعظم محمد علی جناح" کی ضرورت — محمد بلال — ۲

مہنگی کتابیں یا سستا ذوق — محمد بلال — ۸

قرآنیات

البیان: البقرہ ۲: ۱۲۲-۱۲۵ (۲۳) — جاوید احمد غامدی — ۱۰

معارف نبوی

نفاق کا زمانہ — طالب محسن — ۱۶

وسوسے پر معافی — طالب محسن — ۱۹

تقدیر سے متعلق ایک حدیث کی وضاحت — محمد رفیع مفتی — ۲۲

دین و دانش

قانون جہاد (۱) — جاوید احمد غامدی — ۳۲

سبعۃ احرف — محمد اسلم نجمی — ۳۵

عالمِ برزخ — جاوید احمد غامدی / منظور الحسن — ۴۵

ادبیات

میں حاضر ہوں! میں حاضر ہوں! (۵) — محمد بلال — ۶۳

غزل — جاوید احمد غامدی — ۶۷

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

”قائداعظم محمد علی جناح“ کی ضرورت

ایک رات ٹیلی ویژن پر ایک کشمیری نوجوان نے ہندوستانی فوج کے مظالم کی دل خراش داستان سناتے ہوئے کہا: ہندو فوجیوں نے ہمارا پورا گھرانا مجاہدین کو پناہ دینے کے شبے میں گرفتار کر لیا۔ ایک ہندو افسر نے میرے سامنے میری بہن کو بے لباس کر دیا۔ وہ چیخ چیخ کر رحم کی بھیک مانگتی رہی، مگر شیطان صفت افسر قہقہہ لگا کر بولا: آج اتنا چلا کہ تیری آواز محمد بن قاسم کی قبر تک پہنچ جائے۔ کاش! میں یہ منظر دیکھنے سے پہلے مر گیا ہوتا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں، جس پر پاس کھڑے ایک فوجی نے میری آنکھوں پر برچھا مار کر کہا: ٹیپو کی اولاد، دیکھ، آج تجھے یہ سب دیکھنا پڑے گا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا: میری آنکھیں نکال دو۔ میری بہن کو کچھ نہ کہو۔

یہ ایسا واقعہ ہے جسے سن کر ہر مسلمان کا خون کھولنے لگتا ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ سارے حدود کو پھلانگ کر ان ہندوؤں تک پہنچ جائے اور انھیں خود موت کے گھاٹ اتار دے، مگر وہ ایسا نہیں کر پاتا۔ وہ ایسا کیوں نہیں کر پاتا؟ اس کے کئی وجوہ ہیں:

ایک وجہ تو وہی ہے جس کی ایک خاص انداز سے نشان دہی شیطان صفت بھارتی فوجی افسر نے کر دی۔ جی ہاں، آج ہمارے اندر کوئی ”محمد بن قاسم“ نہیں ہے۔ مزید غور کیجیے: آج ہمارے اندر کوئی حجاج بن یوسف نہیں ہے۔ اور گہرائی میں جائیے، آج ہمارے اندر کوئی خلیفہ ولید بن عبد الملک نہیں ہے۔ محمد بن قاسم، حجاج بن یوسف کے سپہ سالار تھے اور حجاج بن یوسف، خلیفہ ولید کے عراق میں گورنر تھے۔ عراق اس وقت کوئی ملک نہیں، اسلامی سلطنت کا ایک صوبہ تھا۔ مگر آج مسلمان قوم ایک نہیں ہے۔ اس کا کوئی ایک حکمران نہیں ہے۔ وہ ملکوں اور تفرقوں میں تقسیم در تقسیم ہو چکی ہے۔ وہ علم و اخلاق کے معاملے میں پستی میں گر چکی ہے۔ سیاست و معیشت کے میدان میں مغلوب ہو چکی ہے۔ قوت و شوکت کے لحاظ سے ذلیل ہو چکی ہے۔ اب اس کے سامنے

اس کی عزت کی چادر تار تار ہو گی، مگر وہ آنکھیں بند کرنے کے سوا، رحم کی بھیک مانگنے کے سوا، ہاتھ جوڑنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی۔

آج اگر مسلمان ایک ہوتے۔ ان کا حکمران ایک ہوتا۔ ان کی فوج ایک ہوتی۔ ان کی کرنسی ایک ہوتی۔ یہ سب مسلم ممالک ریاست ہاے متحدہ اسلامیہ کے مختلف صوبے ہوتے تو کسی ملک کے کسی فوجی کی مجال تھی کہ کسی مسلمان کی بہن کو اس کے بھائی کے سامنے یوں رسوا کرتا۔ یا اگرچہ مسلمان ملک الگ الگ ہوتے، ان کے حکمران الگ الگ ہوتے، مگر وہ اندر سے ایک ہوتے تب بھی صورتِ حال مختلف ہوتی۔ پاکستانی فوج کشمیر میں مسلح اقدام کرتی۔ تمام مسلم ممالک پاکستان کی پشت پر ہوتے۔ ایک ہی حملہ ہوتا اور مسئلہ حل ہو چکا ہوتا، مگر افسوس ہے کہ اس وقت مسلمان کسی بھی لحاظ سے ایک نہیں ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس قسم کے حالات میں کشمیر کے معاملے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے؟ کیا مختلف گروہوں کی شکل میں سرحد پار کر کے گوریلوں کی طرح، بھارتی فوجیوں پر کبھی کبھار کوئی حملہ کر دیا جائے تاکہ ایک دن بھارت تھک ہار کر کشمیر کا مسئلہ پاکستان کی خواہش کے مطابق حل کرنے پر آمادہ ہو جائے؟ دین و دانش اور اخلاق کی روشنی میں کوئی شخص بھی اس کا مثبت جواب نہیں دے سکتا۔ دین میں جہاد و قتال ہمیشہ حکومت کرتی ہے۔ جہاد و قتال کے لیے سیاسی اقتدار پہلی شرط ہے۔ کسی نبی نے سیاسی اقتدار حاصل کیے بغیر کبھی جہاد و قتال نہیں کیا۔ اور کیا بھارت جیسے بہت بڑے ملک کی بہت بڑی فوج کو چند گروہ شکست دے سکتے ہیں؟ ہمارا خیال ہے، اس کا جواب بھی بالکل واضح ہے۔ پھر پاکستان کی حکومت نے بھارت کے ساتھ باہمی اختلافات پرامن ذرائع سے حل کرنے کے معاہدے کر رکھے ہیں۔ دین و اخلاق ہمیں اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتے کہ ان معاہدات کی ادنیٰ درجے میں بھی خلاف ورزی کی جائے۔ اس ضمن میں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندو ایک مکار اور فریبی قوم ہے۔ ان کے ساتھ کیے گئے معاہدات کی کیا وقعت؟ ایسے لوگوں کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے مقام پر جو معاہدہ کیا تھا وہ کفار کے ساتھ کیا تھا۔

عہد کی پاس داری بے حد اہم معاملہ ہے۔ عہد شکنی بڑے سنگین اخروی نتائج کا باعث بن سکتی ہے۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر خود اپنے بارے میں فرمایا ہے:

''خدا اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔'' (الروم ۳۰:۶)

''اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے۔'' (التوبہ ۹:۱۱۱)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

جس طرح خدا اپنے وعدے کا سچا اور عہد کا پکا ہے، اسی طرح وہ ہم سے بھی یہ چاہتا ہے کہ ہم جو قول و قرار کریں، اس کے پابند رہیں۔

وہ اہلِ جنت کی خوبی بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

''جو اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں۔'' (المعارج ۷۰: ۳۲)

اسی طرح اخروی احتساب سے خبردار کرتے ہوئے کہتا ہے:

''اور عہد کو پورا کرو کیونکہ (قیامت میں) عہد کی پرسش ہونی ہے۔'' (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۵)

پھر اپنے ساتھ سچی وفاداری کرنے والوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

''جب معاہدہ کر بیٹھیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہوں۔'' (البقرہ ۲: ۱۷۷)

صلح حدیبیہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کفارِ مکہ سے یہ عہد کر لیا تھا کہ ہم مکہ میں پہلے سے موجود مسلمانوں کو اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے۔ عین اس وقت جب یہ معاہدہ لکھا جا رہا تھا، مکہ میں قید نو مسلم حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ، جن پر کفار نے بہت ظلم ڈھائے تھے، کسی طرح بھاگ کر وہاں پہنچ گئے۔ ان کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ وہ سب کے سامنے گر پڑے۔ ان پر کفار نے اتنا ظلم کیا تھا کہ ان کے سارے جسم پر زخم دکھائی دے رہے تھے، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدے کی پاس داری کرتے ہوئے انھیں اپنے ساتھ لے جانے سے گریز کیا۔ ابوجندل رضی اللہ عنہ نے وہاں موجود مسلمانوں کو اپنے زخم دکھائے اور چلا کر کہا: ''کیا پھر مجھے اس حالت میں دیکھنا چاہتے ہو؟ پھر مجھے کافروں کے حوالے کرنا چاہتے ہو؟ میں اسلام لا چکا ہوں۔'' تمام مسلمان تڑپ اٹھے۔ حضرت عمر نے اپنے انداز سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے احتجاج کیا، مگر خدا کے نبی نے فرمایا: ''میں اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔'' چودہ سو صحابہ آپ کے اشارۂ ابرو پر جان لینے اور جان دینے کے لیے تیار تھے، مگر ایک عہد ہو چکا تھا۔ رسول اللہ نے ابوجندل سے کہا: ''ہم بدعہدی نہیں کر سکتے۔ صبر اور ضبط سے کام لو۔ خدا تمھارے لیے اور مظلوموں کے لیے کوئی راہ نکالے گا۔'' لہٰذا ابوجندل کو اسی طرح پابہ زنجیر واپس جانا پڑا۔

سوال یہ ہے کہ جب معاہدے کا دوسرا فریق عہد کی خلاف ورزی کرے تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟ اس صورت میں باقاعدہ اور علانیہ معاہدے سے الگ ہونے کا اعلان کرنا چاہیے۔ دوسرے فریق کو صاف صاف بتا دینا چاہیے کہ اب ہمارے اور تمھارے درمیان معاہدہ باقی نہیں رہا۔ دوسرے فریق کو اپنی اصلاح کرنے کی

مہلت دینی چاہیے۔ مخالفانہ کارروائی سے گریز کرنا چاہیے اور مہلت کا عرصہ گزرنے کے بعد کوئی کارروائی کرنی چاہیے۔ عہدِ نبوی میں مدینہ کے یہود کی عہد شکنی کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اور اگر تمھیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو۔"

(الانفال ۸:۵۸)

صلحِ حدیبیہ کے بعد عرب میں اسلامی ریاست کی طاقت اتنی بڑھ گئی کہ کفار اس کے مقابلے میں خود کو کمزور محسوس کرنے لگے تھے جس کی وجہ سے ان کے پرجوش عناصر نے معاہدے کی خلاف ورزی کرنی شروع کر دی۔ اس عہد شکنی پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"ان مشرکین سے اللہ اور رسول کی طرف سے اعلانِ براءت ہے جن سے تم نے معاہدے کیے تھے۔ سو اب ملک میں چار ماہ چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کے قابو سے باہر نہیں جا سکتے اور اللہ کافروں کو رسوا کر کے رہے گا۔ اور اللہ و رسول کی طرف سے بڑے حج کے دن لوگوں میں منادی کر دی جائے گی کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بری الذمہ ہیں۔" (التوبہ ۹:۱-۳)

چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے موقع پر، جب ملک کے کونے کونے سے لوگ جمع ہوتے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معاہدے سے الگ ہونے اور مہلت پر مبنی اس حکمِ خداوندی کا اعلان کرنے پر مامور کیا۔

مطلب یہ ہے کہ اس بات کی کوئی وقعت نہیں ہے کہ ہندو کیسی قوم ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم ان کے ساتھ ایک معاہدے میں بندھے ہوئے ہیں۔ اور کوئی باشعور مسلمان معاہدے کی خلاف ورزی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

اس صورتِ حال میں پاکستان کے مختلف گروہوں کے مقبوضہ کشمیر میں مسلح اقدام کو ایک اور پہلو سے بھی زیرِ غور لانے کی ضرورت ہے۔ اس پہلو کی جانب ہمارے پرجوش عناصر کی بالعموم توجہ نہیں جاتی۔

غور کیجیے، جب پاکستانی یا مقامی مسلمان گروہ بھارتی فوج پر وقتاً فوقتاً حملہ کر کے واپس اپنے مورچوں میں آجاتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس پر بھارتی فوج آرام سے تو نہیں بیٹھ سکتی۔ وہ نہتے کشمیریوں پر ظلم کر کے اپنے انتقام کی آگ بجھاتی ہے۔ اس تحریر کے آغاز میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے، وہ اسی انتقام کی ایک مثال ہے۔

اس کے علاوہ اس بات کا ایک اور ردِ عمل بھی ہوتا ہے۔ بھارت میں پاکستان سے زائد یعنی ۲۰ کروڑ مسلمان

آباد ہیں۔ وہ بھارتی ہندو قوم کے انتقام کا نشانہ بنتے ہیں۔ بھارت کے مسلمانوں کے رسالے ''درالعلوم'' کے اداریے میں حبیب الرحمٰن قاسمی صاحب لکھتے ہیں:

''پاکستان میں بسنے والے مسلمان خود اپنے فعل کے ذمہ دار ہیں ان کے کسی عمل کی ذمہ داری ہندوستان میں آباد کسی بھی مسلمان پر عائد نہیں ہوتی، ان میں سے ہر ایک اپنے فعل اور اپنے اچھے برے کا ذمہ دار ہے اس لیے کشمیر کے دہشت گردوں کی حالیہ خلافِ انسانیت حرکت کے ردِ عمل میں گجرات وغیرہ میں وہاں کے مسلمانوں کے جان و مال کو تباہ کرنا اور اس پر اربابِ اقتدار کی خاموشی بھی اتنی ہی غیر مناسب ہے، جتنی کہ پاکستان کا ہندوستان کے داخلی امور میں بے جا مداخلت کرنا اور دہشت گردوں کا بلاسبب عوام کو قتل کرنا۔''

(جولائی، اگست ۲۰۰۰، ص ۴)

کشمیر کے حالات ہی کے حوالے سے بھارت کے مسلمانوں کے اور ایک رسالے ''معارف'' کے اداریے میں بھی کہا گیا ہے:

''ہمیں افسوس ہے کہ اس طرح کے سنگین معاملات میں خواہ مخواہ تحقیق کے بغیر ہی ہندوستان کے مسلمانوں کو ملوث کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، حد ہوگئی ہے کہ عیسائیوں کے قتل اور ان کے گرجاؤں کے جلائے جانے کا الزام بھی انھی کے سر منڈھا جا رہا ہے، اگر عام لوگ غیر ذمہ دارانہ اور اشتعال انگیز بیان دیں تو حکومت کا فرض ہے کہ ان کے خلاف سخت اقدام کرے مگر وہ تو خود اس طرح کے واقعات کا رخ بڑی چابک دستی سے مسلمانوں کی طرف موڑ دیتی ہے، ہمارے وزیر داخلہ کو اس میں بڑی مہارت ہے، کشمیر میں ہونے والے واقعات کی صحیح تحقیق و تفتیش اصل اسباب اور واقعی مجرموں کا پتہ لگانے کے بجائے اٹکل پچو بیانات دیے جا رہے ہیں، جن سے فائدہ اٹھا کر ہندوؤں کی جارحانہ تنظیموں نے بھارت بند کے دوران فرقہ وارانہ ماحول گرم کیا اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کی مہم چلائی، چنانچہ کشمیر کے واقعات کے بعد گجرات اور بعض دوسری جگہوں میں فرقہ وارانہ فسادات ہوگئے۔ جن میں چند بے گناہ مسلمان جاں بحق ہوئے۔''

(اگست ۲۰۰۰، ص ۸۲)

اسی طرح بھارت کے ممتاز صحافی کلدیپ نیر نے پچھلے دنوں اپنے ایک کالم میں ہندوستان کے اقلیتی کمیشن کے حوالے سے لکھا ہے:

''حال ہی میں جب اس کے ارکان صوبہ گجرات کے دورے پر گئے تو وہاں مسلمان دشمنی کے جذبات کی

شدت دیکھ کر حیران اور پریشان ہو گئے۔ احمد آباد میں جو نئی بستیاں آباد ہو رہی ہیں وہاں مسلمانوں کو داخل ہونے سے روک دیا گیا ہے۔ بعض مسلمان بڑے بڑے رہایشی منصوبوں میں آٹھ آٹھ دس دس لاکھ روپے کی لاگت سے فلیٹس خرید چکے تھے لیکن انھیں بتا دیا گیا ہے کہ آپ ان میں رہایش اختیار نہیں کر سکتے، کیونکہ ہندو اس کو پسند نہیں کرتے۔'' (جنگ، ۲۳ستمبر ۲۰۰۰)

کشمیر کے حالات کے اس حقیقت پسندانہ جائزے کے بعد یہی بات کہی جا سکتی ہے کہ آج ایک ''قائداعظم محمد علی جناح'' کی ضرورت ہے جو سیاسی اور قانونی طریقے سے مسئلۂ کشمیر حل کرنے کی جدوجہد کرے، جو اخلاقی تقاضوں کو مدنظر رکھے، جو زمینی حقائق کے مطابق سوچے، جو عقل و دانش کو بروئے کار لائے اور کشمیریوں کے حقِ خود ارادیت کے حق میں اقوامِ متحدہ کی جو قرار دادیں موجود ہیں، ان قرار دادوں کو ''قرار دادِ پاکستان'' کی طرح پورا کرائے۔ بلاشبہ موجودہ حالات میں کوئی ''قائداعظم محمد علی جناح'' ہی یہ مسئلہ حل کر سکتا ہے۔

ممکن ہے کہ ہماری اس بات کو لوگ ''دیوانے کا خواب'' قرار دیں، مگر ہم ان لوگوں کی خدمت میں عرض کریں گے کہ پاکستان ــــ جو کشمیر سے بہت بڑا تھا ــــ کے قیام کو بھی ''دیوانے کا خواب'' قرار دیا جاتا تھا، مگر وہ خواب صورت پذیر ہو گیا تھا۔

ــــ محمد بلال

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مہنگی کتابیں یا سستا ذوق

معروف اشاعتی ادارے ''مقبول اکیڈمی'' کے سربراہ ملک مقبول احمد صاحب نے کہا ہے:

''یہ کہنا غلط ہے کہ کتابیں مہنگی ہونے کی وجہ سے مطالعہ میں کمی واقع ہوئی ہے۔ جب لوگ ایک برگر کھانے کے لیے کئی سو روپے خرچ کر سکتے ہیں تو اچھی کتاب کیوں نہیں خرید سکتے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کی ترجیحات بدل گئی ہیں۔ پہلے کتابوں کے خریدار زیادہ تھے، کتابیں کم تھیں، آج کتابیں زیادہ ہیں لیکن خریدار کم ہیں۔'' (دن، ۲۴ ستمبر ۲۰۰۰)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مقبول صاحب کی یہ بات بالکل صحیح ہے۔ واقعی آج اگر کھانے پینے کی دکانوں پر جائیں تو لوگوں کی بے حد بھیڑ دکھائی دیتی ہے۔ کھانے پینے کا کام کرنے والے بھی مالی اعتبار سے بہت خوش حال ہوتے ہیں، مگر کتابوں کی دکانوں اور لائبریریوں میں لوگوں کی اس طرح بھیڑ دکھائی نہیں دیتی۔ اسی طرح پڑھنے لکھنے کا کام کرنے والے بھی بالعموم مالی اعتبار سے تنگ دست ہی ہوتے ہیں۔ یہ اس بات کی واضح علامت ہے کہ ہمارے ملک میں پڑھنے لکھنے کی طرف لوگوں کا رجحان کم ہو رہا ہے۔

دکانوں میں خواتین کی بے ہودہ تصاویر اور گھٹیا مواد پر مبنی بہت سے رسائل لٹکے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان رسائل میں اشتہارات کی بھی بھرمار ہوتی ہے۔ لوگ ایسے رسائل خریدتے بھی بڑے شوق سے ہیں۔ ایسے رسائل مالی اعتبار سے بھی بہت اچھے ہوتے ہیں، مگر دینی، اخلاقی اور علمی موضوعات پر مبنی کم و بیش تمام رسائل دکانوں پر اس طرح دکھائی نہیں دیتے، انھیں اشتہارات بھی اس طرح نہیں ملتے اور پھر لوگ انھیں اعزازی طور پر ہی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی بے ہودہ رسائل کے قارئین اپنے گھٹیا شوق کی تکمیل کے لیے خوشی سے پیسے خرچ کرنے کے لیے تیار ہیں، مگر دینی اور علمی لوگ اپنے اعلیٰ ذوق کی تکمیل کے لیے پیسے خرچ کرنے پر

آمادہ نہیں ہیں۔

ایک دفعہ میں ایک بہت امیر آدمی سے ملا۔ ان کا تین یا چار کنال پر مشتمل گھر تھا۔ ان کے باورچی خانے نے جتنا رقبہ گھیرا ہوا تھا، اتنے رقبے میں ایک غریب گھرانا زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ ان کا لان اتنا وسیع تھا کہ اس پر غریب لوگوں کے سات آٹھ کوارٹر بن سکتے تھے۔ کھانے کے وقت انھوں نے میز پر کئی قسم کے کھانے سجا دیے، مگر مجھے ''اشراق'' کے حوالے سے یہ کہا: ''پہلے آپ مجھے اعزازی رسالہ بھیجا کرتے تھے، پھر آپ لوگوں نے بند کر دیا۔[1] اس کے بعد میں نے ''اشراق'' نہیں پڑھا۔''

مطلب یہ ہے کہ لوگ خوش حال ہونے کے باوجود مہینے میں ۱۵ یا ۲۰ روپے خرچ کرنے کو پیسے کا ضیاع سمجھتے ہیں، مگر کھانے، پینے، پہننے اور رسوم و رواج پر سیکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں روپے خرچ کر ڈالنے میں بھی کوئی حرج محسوس نہیں کرتے۔ چنانچہ ہم بھی یہ بات کہنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے کہ کتب اور رسائل مہنگے نہیں ہوئے، درحقیقت لوگوں کے ذوق و شوق سستے ہو گئے ہیں۔ لوگوں کے پاس وسائل موجود ہیں، مگر علم و آگہی کے معاملے میں وہ ''غریب'' ہو گئے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

—— محمد بلال

۱۔ ''اشراق'' مالی اعتبار سے گرم سرد حالات سے دوچار رہتا ہے۔ جب حالات خراب ہوتے ہیں تو بسا اوقات ''اشراق'' کی اعزازی ترسیل بند کرنا پڑتی ہے۔

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(۲۳)

(گذشتہ سے پیوستہ)

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ

اے[۲۹۳] بنی اسرائیل، میری اُس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی تھی[۲۹۴] اور اِس بات کو کہ

۲۹۳۔ سورہ کی پہلی فصل آیت ۱۲۱ پر ختم ہوئی۔ یہاں سے دوسری فصل شروع ہو رہی ہے، لہٰذا نظم کے لحاظ سے آگے کا مضمون اب پچھلے کسی پیرے سے نہیں، بلکہ پوری فصل کے ساتھ مربوط ہے۔ پچھلی فصل میں یہ حقیقت اچھی طرح واضح کر دی گئی ہے کہ اہلِ کتاب، بالخصوص یہود کے لیے دینِ حق کی طرف آنے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ اُن کا یہ زعم ہے کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہدایت اور نجات اگر حاصل ہو سکتی ہے تو صرف اِسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ آدمی یہود و نصاریٰ میں سے کسی ایک کا دین اختیار کرے۔ اس دوسری فصل میں اہلِ کتاب کے انھی مزعومات کی تردید کے لیے سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے فرزندوں کی سرگزشت کا وہ حصہ اُن کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے جس سے اُن کی تردید کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کی دعوت کی پوری پوری تائید بھی ہو رہی ہے۔ اہلِ کتاب کے لیے یہ مضمون گویا اتمامِ حجت کے اسلوب میں اِس بات کی دعوت ہے کہ یہودیت اور نصرانیت کے تعصبات کو چھوڑ

عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا وَّلَا یُقْبَلُ
مِنْھَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُھَا شَفَاعَۃٌ وَّلَا ھُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾
وَاِذِ ابْتَلٰۤی اِبْرٰھٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّھُنَّ ط قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ

میں نے تمھیں دنیا والوں پر فضیلت دی تھی[۲۹۵] اور اُس دن سے ڈرو[۲۹۶] جب کوئی کسی کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ اُس سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ لوگوں کو کوئی مدد ہی ملے گی۔[۲۹۷] ۱۲۲-۱۲۳

اور یاد کرو، جب ابراہیم کو اُس کے پروردگار نے چند باتوں[۲۹۸] میں آزمایا[۲۹۹] تو اُس نے وہ پوری

کر وہ اِس دینِ ابراہیمی کی پیروی کریں جس کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم انھیں بلا رہے ہیں۔ پچھلی فصل کے پورے مضمون کو اس لحاظ سے یہ فصل اس کے نقطۂ عروج پر پہنچا دیتی ہے۔ اِس کی ابتدا اگر غور کیجیے تو انھی آیات (۴۷-۴۸) سے ہوئی ہے جو پچھلی فصل کے شروع میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ یہ اعادہ سورہ کے مضمون میں اِس وصل و فصل کو بالکل نمایاں کر دیتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۲۹۴۔ یعنی دنیا میں جو کچھ فضیلت بھی تمھیں حاصل رہی ہے، محض اللہ تعالیٰ کی عنایت سے حاصل رہی ہے۔ اِس میں نہ تمھارے استحقاق کو کوئی دخل ہے اور نہ تمھاری خاندانی شرافت کو۔ اِس لیے اِس کے غرور میں مبتلا ہو کر اِس دعوت سے منہ نہ موڑو جو اِس وقت تمھارے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔

۲۹۵۔ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے اور اس اجمال کی وضاحت ہے جو لفظ نعمت میں موجود ہے۔ فضیلت سے مراد یہاں قوموں پر حق کی شہادت کا وہی منصب ہے جس پر بنی اسرائیل صدیوں فائز رہے ہیں۔

۲۹۶۔ یعنی اس دعوت کو قبول کرو اور اِس کے معاملے میں اُس دن سے ڈرو جس میں تمھیں اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔

۲۹۷۔ یعنی اِس خیال میں نہ رہو کہ تم چونکہ ابراہیم اور اسحاق و یعقوب جیسے انبیا علیہم السلام کی اولاد ہو، اس لیے روزِ قیامت تمھاری نجات کے لیے اُن بزرگوں کی نسبت ہی کافی ہے۔ یاد رکھو، وہاں عمل کے سوا کوئی چیز بھی تمھارے کام نہ آسکے گی۔

۲۹۸۔ اصل میں لفظ ’کلمٰت‘ آیا ہے جو ’کلمۃ‘ کی جمع ہے۔ یہ مفرد لفظ کے معنی میں بھی آتا ہے اور پوری

اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

کر دیں،[۳۰۰] فرمایا: میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمھیں لوگوں[۳۰۱] کا امام بناؤں گا۔[۳۰۲] عرض کیا: اور

بات کے لیے بھی۔ یہاں اِس سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ احکام ہیں جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو ایمان واسلام پر اُن کی استقامت کے امتحان کے لیے دیے گئے اور انھوں نے بغیر کسی تردد کے بے چون وچرا اُن کی تعمیل کی۔ مثلاً، خاندان اور قوم ووطن سے ہجرت اور دشتِ غربت میں اکلوتے فرزند کی قربانی۔ ان احکام کے لیے لفظ 'كلمة'، اگر غور کیجیے تو نہایت موزوں استعمال ہوا ہے۔ اپنے معنی کے لحاظ سے یہ ایک قسم کے ابہام واجمال کا حامل ہے۔ سیدنا ابراہیم کو اُن کے امتحان کے لیے جو احکام دیے گئے، اُن کی نوعیت بھی یہی تھی کہ حکم تو دیا گیا، لیکن اُس کا صلہ اور فلسفہ بیان نہیں کیا گیا۔ گویا ایک مجمل بات بغیر کسی وضاحت کے سامنے رکھ دی گئی کہ وہ اسے پورا کر دیں۔

۲۹۹۔ اصل میں لفظ 'ابتلا' استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی جانچنے اور امتحان کرنے کے ہیں۔ بندوں کی اخلاقی تربیت کے لیے یہ اللہ تعالیٰ کی ایک سنت ہے۔ اِسی سے اُن کی چھپی ہوئی صلاحیتیں ابھرتی اور پروان چڑھتی ہیں اور اِسی سے اُن کے کھوٹے اور کھرے کو الگ کیا جاتا ہے۔

۳۰۰۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو جن امتحانوں میں ڈالا، اُن میں سے ہر امتحان نہایت کٹھن تھا۔ وہ ان سب میں پورے اترے، لیکن بیٹے کی قربانی کا امتحان اِن سب سے بڑھ کر تھا۔ اس میں پورا اترنا تو الگ رہا، اس کا تصور بھی ہماشما کے لیے آسان نہیں ہے۔ تاہم سیدنا ابراہیم اس میں بھی ہر لحاظ سے پورے اترے اور خدا کے حکم پر اپنے سیزدہ سالہ اکلوتے اور محبوب فرزند کو قربانی کے لیے ماتھے کے بل پچھاڑ دیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ابراہیم تو نے تو خواب کو سچ کر دکھایا۔ یہی موقع تھا جب اللہ تعالیٰ نے اُن سے وعدہ کیا کہ میں تمھیں لوگوں کا امام بناؤں گا۔

۳۰۱۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام جن لوگوں کے امام بنائے گئے، اُن کے لیے اصل میں لفظ 'الناس' استعمال ہوا ہے۔ اس میں لام عہد کا ہے اور اس سے مراد ذریتِ ابراہیم ہے، عام اس سے کہ وہ سیدنا اسحاق کی نسل سے ہوں یا سیدنا اسمٰعیل کی نسل سے۔ نبوت اسی ذریتِ ابراہیم پر ختم ہوئی اور ایمان وہدایت کی دولت دنیا نے انھی کے ذریعے سے پائی۔

۳۰۲۔ یہ ایک ہی وعدہ بیک وقت دو وعدوں پر مشتمل ہے: ایک یہ کہ اُن کی نسل سے عظیم قومیں پیدا ہوں

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھٖمَ

میری اولاد میں سے؟ فرمایا: میرا یہ عہد اُن میں سے ظالموں کو شامل نہیں ہے۔[۳۰۳] ۱۲۴

اور یاد کرو، جب ہم نے (سرزمینِ عرب میں) اِس بیت الحرام[۳۰۴] کو لوگوں[۳۰۵] کا مرجع اور

گی، دوسرے یہ کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اُن سب کے امام اور پیشوا ہوں گے۔ بائیبل کی کتابِ پیدایش میں اس وعدے کا ذکر اس طرح ہوا ہے:

''اور خداوند کے فرشتے نے آسمان سے دوبارہ ابراہام کو پکارا اور کہا کہ خداوند فرماتا ہے کہ چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے، دریغ نہ رکھا۔ اس لیے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کی مانند کر دوں گا اور تیری اولاد اپنے دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہو گی اور تیری نسل کے وسیلے سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی، کیونکہ تو نے میری بات مانی۔'' (۲۲: ۱۵-۱۸)

۳۰۳۔ اس سے مخاطبین کو یہ بتانا مقصود ہے کہ ابراہیم سے تعلق کی بنا پر وہ اگر اپنے آپ کو ایمان و عمل کی ذمہ داری سے سبک دوش سمجھے ہوئے ہیں تو اُن کا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جس دن ابراہیم کو امامت کا یہ منصب دیا تھا، اسی دن یہ بات بھی اُن پر واضح کر دی تھی کہ تمھاری ذریت میں سے جو لوگ تمھارے طریقے پر قائم اور میری ہدایت کے پیرو رہیں گے، اس امامت کے وارث بھی وہی ہوں گے۔ ان میں سے جو میرے ساتھ اپنا عہد توڑ کر شیطان کے راستے پر چل پڑیں گے، اُن کے لیے اس امامت میں کوئی حصہ نہ ہو گا۔

۳۰۴۔ اصل میں لفظ 'البیت' آیا ہے۔ اس میں لام عہد کا ہے۔ اور اس سے مراد ام القریٰ مکہ کا بیت الحرام ہے۔ بائیبل میں اسے بیتِ ایل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایل کے معنی عبرانی میں اللہ کے ہیں۔ پیدایش میں ہے:

''اور ابرام اُس ملک میں سے گزرتا ہوا مقام سکم میں مورہ (مروہ) کے بلوط تک پہنچا۔ اُس وقت ملک میں کنعانی رہتے تھے۔ تب خداوند نے ابرام کو دکھائی دے کر کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا اور اس نے وہاں خداوند کے لیے جو اُسے دکھائی دیا تھا، ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں سے کوچ کر کے اُس پہاڑ کی طرف گیا جو بیتِ ایل کے مشرق میں ہے اور اپنا ڈیرا ایسے لگایا کہ بیتِ ایل مغرب میں اور عی مشرق میں پڑا اور وہاں اُس نے

مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ

اُن کے لیے پناہ کی جگہ قرار دیا اور حکم دیا کہ ابراہیم کی اس قیام گاہ میں نماز کی ایک جگہ بناؤ[۳۰۶] اور

خداوند کے لیے ایک قربان گاہ بنائی اور خداوند سے دعا کی۔'' (۱۲: ۶-۸)

امام فراہی نے اپنے رسالہ ''الرای الصحیح فی من ہو الذبیح'' میں بعض دوسرے اشارات وقرائن سے بھی یہ بات پوری قطعیت سے ثابت کر دی ہے کہ ابراہیم نے جو معبد بنایا، وہ یہی بیت الحرام ہے۔ ذریتِ ابراہیم کی عبادت اور قربانی کا قبلہ، عام اس سے کہ وہ بنی اسمٰعیل ہوں یا بنی اسرائیل ہمیشہ سے ام القریٰ مکہ کا بیت اللہ ہی ہے۔ یہود نے محض تعصب کی وجہ سے اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

۳۰۵۔ لوگوں سے مراد یہاں بھی وہی ذریتِ ابراہیم ہے جس کا ذکر اوپر 'انی جاعلك للناس اماماً' میں ہوا ہے۔ دنیا کی تمام اقوام کے لیے اس گھر کی برکتیں انھی کی وساطت سے عام ہوئیں۔

۳۰۶۔ اصل الفاظ ہیں: 'واتخذوا من مقام ابراهيم مصلّٰى'۔ یہ اوپر والے جملے ہی کی مزید وضاحت ہے اس کے ساتھ 'قال' یا اس طرح کا کوئی دوسرا لفظ اسی وجہ سے نہیں آیا۔ پہلے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو ذریتِ ابراہیم کا قبلہ ٹھیرایا۔ پھر وضاحت کی ہے کہ اسی فیصلے کو روبہ عمل کرنے کے لیے ابراہیم اور اس کی ذریت کو حکم ہوا کہ ابراہیم کی اس قیام گاہ کے ایک حصے میں نماز کی جگہ بناؤ۔ بیت اللہ کو یہاں 'مصلّٰی' یعنی نماز کی جگہ سے اس لیے تعبیر کیا ہے کہ یہود پر یہ حقیقت واضح کی جائے کہ خدا کا یہ گھر درحقیقت ایک مسجد ہی کی حیثیت سے تعمیر کیا گیا تھا اور اب خدا کا پیغمبر اس کی اسی حیثیت کی تجدید کے لیے مبعوث ہوا ہے۔ اسی طرح مکہ کے لیے ابراہیم کی قیام گاہ کی تعبیر اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ یہود نے مروہ کی قربان گاہ اور بیت اللہ سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا تعلق بالکل کاٹ دینے کے لیے اپنی کتابوں کے بیانات میں جگہ جگہ تحریفات کر دی تھیں۔ قرآن نے یہ لفظ استعمال کر کے انھی تحریفات کی تردید کی ہے۔ امام فراہی نے اپنے اسی رسالہ میں جس کا ذکر اوپر ہوا ہے، یہود کی ان تحریفات کا پردہ خود انھی کی کتابوں کے دلائل سے بالکل چاک کر دیا ہے۔ استاذ امام اپنی تفسیر ''تدبرِ قرآن'' میں لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے تورات ہی کے بیانات سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے وطن سے نکلنے کے بعد حضرت اسحاق کی والدہ کو تو کنعان میں چھوڑا اور خود حضرت اسمٰعیل اور اُن کی والدہ کے ساتھ بیر سبع کے

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿١٢٥﴾

ابراہیم و اسمٰعیل کو اس بات کا پابند کیا[307] کہ میرے اِس گھر کو اُن لوگوں کے لیے پاک رکھو[308] جو (اِس میں) طواف کرنے، اعتکاف کرنے اور رکوع و سجدہ کرنے کے لیے آئیں۔[309] ۱۲۵

بیابان میں قیام کیا۔ یہ جگہ ایک غیر آباد جگہ تھی۔ اس وجہ سے انھوں نے یہاں سات کنوئیں کھودے اور درخت لگائے۔ یہیں ان کو اکلوتے بیٹے کی قربانی کا حکم صادر ہوا اور وہ حضرت اسمٰعیل کو لے کر مروہ کی پہاڑی کے پاس آئے اور اس حکم کی تعمیل کی۔ اسی پہاڑی کے پاس انھوں نے حضرت اسمٰعیل کو آباد کیا۔ پھر یہاں سے لوٹ کر وہ بیر سبع گئے اور اپنے قیام کے لیے ایسی جگہ منتخب کی جو خانہ کعبہ کے قریب بھی ہو اور جہاں سے وقتاً فوقتاً حضرت اسحٰق کو دیکھنے کے لیے جانا بھی آسانی سے ممکن ہو سکے۔'' (ج ۱ ص ۳۳۰)

۳۰۷۔ اصل میں 'عھدنا الی ابراھیم' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں 'عہد' کے ساتھ 'الی' کا صلہ دلیل ہے کہ یہاں یہ ذمہ داری ڈالنے اور پابند کرنے کے معنی میں ہے۔

۳۰۸۔ یعنی غلاظت، لہو و لعب، اصنام و اوثان اور اس طرح کی کوئی ظاہری اور باطنی نجاست اس گھر میں نہیں ہونی چاہیے۔

۳۰۹۔ طواف نذر کے پھیرے ہیں جو اپنا جان و مال اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کر دینے کی علامت کے طور پر معبد کے ارد گرد لگائے جاتے ہیں۔ اس کی ابتدا حجرِ اسود کے استلام سے ہوتی ہے۔ یہ عہد و میثاق کی علامت ہے۔ اعتکاف دھیان گیان اور ذکر و فکر کے لیے کیا جاتا ہے اور رکوع و سجود نماز کی تعبیر ہے۔ قرآن کے اس بیان سے واضح ہے کہ یہ دینِ ابراہیمی کی قدیم عبادات ہیں۔ مسلمان جس طرح اب ان سے واقف ہیں، قرآن کے مخاطبین بھی اسی طرح ان سے واقف تھے۔ قرآن نے ان کا ذکر کسی نئے حکم کے طور پر نہیں، بلکہ پہلے سے معلوم اور متعارف عبادات کی حیثیت سے کیا ہے۔ لہٰذا ان کا نام ہی اس کے مخاطبین کو ان کا مصداق سمجھانے کے لیے کافی ہے، اس کے لیے کسی تفصیل اور وضاحت کی ہر گز کوئی ضرورت نہ تھی۔

(باقی)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

طالب محسن

نفاق کا زمانہ

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث: ۶۲)

عن حذیفة رضی الله عنه قال: إنما النفاق کان علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم. فأما الیوم، فإنما هو الکفر أو الایمان.

''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ منافقت صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پائی جاتی تھی۔ آج صرف کفر ہے یا ایمان۔''

لغوی مباحث

النفاق: وہ رویہ جس میں ظاہر کچھ ہو اور باطن کچھ۔

الیوم: آج۔ اصل میں زمانۂ حاضر مراد ہے۔

متون

حضرت حذیفہ سے اس کے برعکس مضمون کی حامل ایک اور روایت بخاری ہی نے روایت کی ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

عن حذیفة بن الیمان رضی الله عنه قال: إن المنافقین الیوم شر منهم علی

''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آج کے منافقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے

عهد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کانوا یومئذ یسرون والیوم یجھرون.

(بخاری، کتاب الفتن، باب ۲۰)

زمانے کے منافقین سے زیادہ برے ہیں۔ وہ ان دنوں چھپایا کرتے تھے اور یہ ظاہر کرتے ہیں۔"

یہ روایت اور زیرِ بحث روایت دونوں بخاری ہی نے روایت کی ہیں۔ اور بخاری میں بھی ان کا ایک ایک متن ہی درج ہوا ہے۔ لہٰذا ان کے متن کے اختلاف کا کوئی سوال نہیں ہے۔

البتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد منافقت کا معاملہ بعض دوسری روایات میں ضمناً بیان ہو گیا ہے۔ مثلاً مسلم کی ایک روایت میں قربِ قیامت میں دجال کے خروج کے موقع پر مدینہ کے حالات کا ذکر ہوا ہے۔ اس روایت میں 'یخرج إلیه منها کل کافر و منافق'، 'فیخرج إلیه کل منافق و منافقة'[1] (اس کی طرف نکلیں گے کافر اور منافق اس کی طرف نکلیں گے منافق اور منافقہ) کے الفاظ سے واضح ہے کہ منافقت کے حضور کے زمانے کے ساتھ خصوص کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک خطبے میں اس امت کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اندیشے کا ذکر ہوا ہے۔ اس میں بھی منافق ہی زیرِ بحث ہیں۔ آپ کے الفاظ ہیں: "إن أخوف ما أخاف علی هذه الامة کل منافق علیم اللسان" (اس امت کے بارے میں سب سے زیادہ خوف ناک چیز یہ ہے کہ ہر منافق بہت زبان آور ہوتا ہے۔)[2] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے ذریعے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تذکیر واضح کر دیتی ہے کہ ان کے نزدیک بھی منافقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

معنی

متون کی تفصیل میں ہم یہ بات بیان کر چکے ہیں کہ اس معاملے میں حضرت حذیفہ سے متضاد باتیں مروی ہیں۔ ایک میں حضرت حذیفہ بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے زمانے میں منافقین کے وجود کی نفی کر رہے ہیں۔ اور دوسری میں وہ خود ہی یہ کہہ رہے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے منافقین کے مقابلے میں آج کے منافقین زیادہ برے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی منافقت کو چھپاتے تھے اور یہ علی الاعلان

۱۔ مسلم، کتاب الفتن واشراط الساعہ، باب ۲۴۔

۲۔ احمد، مسند عمر بن الخطاب۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

منافقانہ روش اپنائے ہوئے ہیں۔

لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے یہ دونوں بیانات ایک ہی موقع کے ہیں۔ ان کا باہمی تعلق دعوے اور استدلال کا ہے۔ یعنی حضرت حذیفہ کے نزدیک دین کی دشمنی اگر دل میں ہو اور اس کے اظہار یعنی دین کو نقصان پہنچانے کی کوششیں بھی خفیہ رکھی جائیں تو یہ نفاق ہے۔ اگر یہ کام علی الاعلان کیا جا رہا ہو تو یہ نفاق نہیں بلکہ کفر ہے اور اس زمانے میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔ دین کے دشمن دین کے خلاف سرگرمیوں میں کھلے بندوں مصروف ہیں۔ لہٰذا انھیں مسلمانوں میں شمار کر کے ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی طرح مسلمانوں کے حقوق دینے کے بجائے ان کے اوپر ارتداد[3] کا قانون نافذ کرنا چاہیے۔

یہ روایات دو الگ موقع کی روایات بھی ہو سکتی ہیں۔ اس صورت میں زیرِ بحث روایت کا تعلق اس قانون کے نفاذ سے ہو گا، جو منافقین کے حوالے سے سورۂ توبہ میں بیان ہوا ہے۔ سورۂ توبہ کی آیت ۳۸ سے آیت ۹۰ تک منافقین کا کردار اور ان کے ساتھ معاملہ کی نوعیت زیرِ بحث ہے۔ بطورِ خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے استیصال کا حکم دیا گیا ہے اور ان کے لیے دعائے مغفرت سے روک دیا گیا ہے۔ ممکن ہے حضرت حذیفہ نے کسی موقع پر یہ بات بیان کی ہو کہ اب کسی مسلمان کو منافق قرار دے کر سورۂ توبہ کی ان آیات کا اس پر اطلاق درست نہیں ہے۔ یہ احکام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھے۔ اس لیے کہ منافقین کے بارے میں وحی کی وجہ سے وہی یہ متعین کر سکتے تھے کہ فلاں آدمی منافق ہے۔ اب اس کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا۔ لہٰذا اب کسی کو منافق قرار دینا درست نہیں ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کتابیات

بخاری، کتاب الفتن، باب ۲۰۔ مسلم، کتاب الفتن واشراط الساعہ، باب ۲۴۔ احمد، مسند عمر بن الخطاب۔

۳۔ واضح رہے کہ حضور کے مخاطب امی اہلِ عرب کے لیے ارتداد کی سزا موت تھی۔

طالب محسن

وسوسے پر معافی

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث: ۶۳)

عن أبي هريرة رضی اللّٰہ عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ عليه وسلم: إن اللّٰہ تعالٰی تجاوز عن أمتي ما وسوست به صدورها، ما لم تعمل به أو يتكلم به.

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری امت سے دل میں گزرنے والے خیال کے معاملے میں درگزر کا معاملہ کیا ہے۔ جب تک وہ اس پر عمل نہ کر ڈالیں یا اسے زبان سے ادا نہ کر دیں۔''

لغوی مباحث

تجاوز عن: یہ فعل اس صلے کے ساتھ کسی شے کو نظر انداز کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ اس سیاق میں اس سے عفو ودر گزر مراد ہے۔

وسوست: جو بات دل میں آئے یا دل میں ڈالی جائے۔ یہاں یہ خیال آنے کے معنی میں آیا ہے۔

یتکلم: لغوی مطلب تو بات کرنا ہے لیکن یہاں اس سے خیال پر عمل کرنا ہی مراد ہے۔ کچھ برائیوں کا تعلق ہاتھوں اور پاؤں سے ہے اور کچھ کا تعلق زبان سے۔ یہاں بولنے سے یہ دوسری قسم ہی مراد ہے۔

متون

یہ روایت اگرچہ متعدد کتبِ حدیث میں آئی ہے، لیکن اس کے متون میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے اور جو فرق پایا جاتا ہے اس کی نوعیت بھی محض لفظی فرق کی ہے۔ معنی کے تعین میں اس فرق کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مثلاً دیکھیے ایک روایت میں 'ماوسوست به صدورها' کی جگہ 'ماحدثت به أنفسها' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ دونوں جملے بالکل ہم معنی ہیں۔ ایک دوسری روایت میں 'ما لم تعمل به أو تكلم' کے واحد کے صیغوں کے بجائے 'ما لم يتكلموا أو يعملوا به' کی صورت میں جمع کے صیغے روایت ہوئے ہیں۔ ان سے بھی روایت کے معنی میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایک روایت میں 'إن الله تجاوز' کے موقع پر مجہول کا صیغہ 'تُجُوِّزَ' آیا ہے۔ یہ فرق بھی غیر اہم ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ معروف کا اسلوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ بیان سے زیادہ موافقت رکھتا ہے۔ لہٰذا حضور کے اپنے الفاظ یہی ہوں گے۔ اس بات کی تائید اس حقیقت سے بھی ہوتی ہے کہ اس روایت کے ایک ہی متن میں مجہول کا اسلوب آیا ہے۔ باقی پندرہ سے زیادہ متون میں معروف صیغہ ہی روایت ہوا ہے۔

مسلم کی ایک روایت میں قتادہ رحمہ اللہ کا ایک اثر بھی مذکور ہے۔ غالباً انھوں نے اس روایت سے استشہاد کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جب تک طلاق کے الفاظ منہ سے نہ نکالے جائیں، طلاق نہیں ہوتی۔ دل میں طلاق کے خیال کے آنے کی کوئی حیثیت نہیں۔ ان کا قول ہے: 'إذا طلق فی نفسه فليس بشئ' (جب (کوئی) دل میں طلاق دیتا ہے تو یہ کوئی چیز نہیں)۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

معنی

انسانی نفس میں اچھے اور برے ہر طرح کے خیالات آتے رہتے ہیں۔ بسا اوقات آدمی پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور بعض اوقات وہ اپنے خیالات کی رو میں کافی آگے نکل جاتا اور یہ خیال خواہش اور ارادے کی صورت اختیار کرنے لگتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں خبر دی ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وقت تک کوئی گرفت نہیں ہو گی، جب تک بندہ اس کو عملی جامہ نہیں پہنا دیتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی رحمت کا معاملہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برائی کے بارے میں سوچنا بھی ایک برائی ہے۔ چنانچہ اس پر کچھ نہ کچھ گرفت کی جاتی تو یہ غلط نہ ہوتا۔ بطورِ خاص وہ غلط خیالات جن کا باعث شیطان کی وسوسہ اندازی

نہیں ہوتی، لیکن اللہ تعالیٰ نے بندوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں رحمت ہی کو ترجیح دی ہے۔ لہٰذا دل میں آنے والے خیالات کو اس وقت تک قابل گرفت قرار نہیں دیا جب تک وہ عمل میں نہ ڈھل جائیں۔ در حقیقت خیال سے آگے خواہش، ارادے اور عمل کے مراحل ہوتے ہیں۔ جب تک عمل کا مرحلہ نہیں آتا، اس بات کا امکان موجود ہوتا ہے کہ بندہ اپنی اس خواہش اور ارادے سے باز آ جائے۔ جب وہ باز آ جاتا ہے تو یہ چیز اس کے دل میں یہ توقع پیدا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ برائی سے رک جانے کو عفو و درگزر کا معاملہ کرتے ہوئے اس کوتاہی کا ازالہ قرار دیں گے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسی عفو و درگزر کا معاملہ کیا ہے۔

اس روایت میں یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ قول و فعل کی دونوں صورتیں عمل ہی قرار پائیں گی، جو برائیاں زبان کی برائیاں ہیں وہ زبان سے ادا کرنے کی صورت میں اور جو برائیاں عمل کی برائیاں ہیں وہ عمل کی صورت میں ڈھلتے ہی آدمی کو گناہ گار بنا دیں گی۔

کتابیات

بخاری، کتاب العتق، باب ۶۔ کتاب الطلاق، باب ۱۱۔ کتاب الایمان والنذور، باب ۱۵۔ مسلم، کتاب الایمان، باب ۵۸۔ سنن ترمذی، کتاب الطلاق واللعان، باب ۸۔ سنن نسائی، کتاب الطلاق، باب ۲۷۔ ابوداؤد، کتاب الطلاق، باب ۱۴۔ ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب ۱۴۔ احمد، مسند ابوہریرہ۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد رفیع مفتی

تقدیر سے متعلق ایک حدیث کی وضاحت

تقدیر پر ایمان دراصل، اللہ کی دو صفات پر ایمان کا نتیجہ ہے۔ اِن صفات میں سے ایک صفتِ علم اور دوسری صفتِ قدرت ہے۔ اگر اللہ کا علم اور اُس کی قدرت کامل ہے، تو پھر تقدیر کا وجود لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احادیثِ نبوی میں تقدیر پر ایمان ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِس سلسلے میں کئی پہلوؤں سے گفتگو فرمائی ہے۔ آپ کی بیشتر احادیث اِس مسئلے کو بہت عمدہ طریقے سے واضح کرتی ہیں۔ البتہ بعض احادیث اگر بادی النظر سے دیکھی جائیں، تو اِس معاملے میں سخت علمی اشکال کا باعث بنتی ہیں۔ درجِ ذیل حدیث بھی اُنھی میں سے ایک ہے۔ اِس تحریر میں ہمارے پیشِ نظر اِس حدیث کی صحیح تاویل معلوم کرنا ہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

وَ عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: مَا مِنْكُم مِن أَحَدٍ اِلَّا وَ قَدْ كُتِبَ مَقْعَدُه مِن النَّارِ وَ مَقْعَدُهُ مِنَ الجَنَّةِ، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، أَفَلَا نَتَّكِلُ عَلَى كِتَابِنَا وَ نَدَعُ الْعَمَلَ؟ قَالَ: اِعْمَلُوا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِق لَهُ؛ فَأَمَّا مَنْ كَانَ مِن أَهْلِ السَّعَادَةِ فَسَيُيَسَّرُ لِعَمَل السَّعَادَةِ، وَأَمَّا مَنْ كَانَ

”علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے، جس کا ٹھکانا دوزخ یا جنت میں لکھ نہ دیا گیا ہو۔ لوگوں نے کہا: اے اللہ کے رسول، کیا ہم اپنے بارے میں خدا کے لکھے ہوئے پر بھروسا کر کے، عمل کی تگ و دو سے بے نیاز نہ ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا، عمل کرتے رہو۔ ہر آدمی کو اُسی عمل کی توفیق دی جاتی ہے، جس کے لیے اُسے

مِن أَهْلِ الشَّقاوةِ فَسَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ الشَّقاوةِ، ثُمَّ قَرَأَ: (وَ أَمَّا مَن أَعطٰى وَ اتَّقٰى وَ صَدَّقَ بِالحُسنٰى فَسَنُيَسِّرُهُ لِليُسرٰى وَ أَمَّا مَن بَخِلَ وَ استَغنٰى وَ كَذَّبَ بِالحُسنٰى فَسَنُيَسِّرُهُ لِلعُسرٰى).
(بخاری کتاب التفسیر۔ مسلم، کتاب القدر)

تخلیق کیا گیا ہے، چنانچہ اہلِ سعادت (جنتیوں) کو اعمالِ سعادت ہی کی توفیق دی جاتی ہے اور اہلِ شقاوت (دوزخیوں) کو اعمالِ شقاوت ہی کی توفیق دی جاتی ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے (سورۂ لیل کی یہ آیت) پڑھی۔ "سو جس نے انفاق کیا اور پرہیزگاری اختیار کی اور اچھے انجام کو سچ مانا، تو اُسے ہم راحت کی منزل (جنت) کا اہل بنائیں گے، اور جس نے بخل کیا اور بے پروا ہوا اور اچھے انجام کو جھٹلایا، اُس کو ہم کٹھن منزل (دوزخ) کی طرف بڑھنے کے لیے ڈھیل دیں گے۔"

حدیث کے ظاہر الفاظ سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ ہر آدمی کا ٹھکانا جنت یا دوزخ میں پہلے سے لکھ دیا گیا ہے۔

۲۔ ہر آدمی کو اُسی قسم کے اعمال کی توفیق دی جاتی ہے جس قسم کے اعمال کے لیے وہ تخلیق کیا گیا ہے۔ اگر وہ اہلِ سعادت (جنتیوں) میں سے ہے تو اُسے نیک اعمال کی توفیق دی جاتی ہے اور اگر وہ اہلِ شقاوت (دوزخیوں) میں سے ہے تو اُسے اعمالِ بد کی توفیق دی جاتی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی اِس بات کے ثبوت کے لیے جو آیت پڑھی ہے، اُس میں بیان کردہ باتیں یہ ہیں:

۱۔ جس نے انفاق کیا، پرہیزگاری اختیار کی اور اچھے انجام کو سچ مانا، تو اُسے اللہ تعالیٰ راحت کی منزل (جنت) کا اہل بنائیں گے۔ یعنی آدمی اپنے صحیح عقیدے اور نیک اعمال ہی کی بنا پر جنت میں جائے گا۔

۲۔ جس نے بخل کیا، بے پروا ہوا اور اچھے انجام کو جھٹلایا، اُس کو اللہ تعالیٰ کٹھن منزل (دوزخ) کی طرف بڑھنے کے لیے ڈھیل دیں گے۔ یعنی آدمی اپنے باطل عقیدے اور بد اعمال ہی کی بنا پر دوزخ میں جائے گا۔

اِس حدیث پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

پہلا یہ کہ اگر ہر آدمی کا ٹھکانا جنت یا دوزخ میں پہلے سے لکھا جا چکا ہے، تو اِس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پہلے ہی سے یہ طے کیے ہوئے ہے کہ فلاں فلاں کو میں نے دوزخ میں ڈالنا ہے، خواہ وہ اِس کا حق دار ہو یا نہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہو۔اور فلاں فلاں کو میں نے جنت میں لے جانا ہے، خواہ وہ حق دار ہو یا نہ ہو۔ ظاہر ہے یہ سراسر بے انصافی ہے کہ خدا انسان کے اچھا یا بُرا عمل کرنے سے پہلے خود ہی اُس کے لیے جنت یا جہنم طے کر دے۔

دوسرا اعتراض یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ انسان کو اُسی عمل کی توفیق دیتا ہے جس کے لیے خود خدا نے اُسے تخلیق کیا ہو، تو اِس کا بھی صاف مطلب یہی ہے کہ خدا نے انسان کو اختیار و ارادہ کی جو آزادی دے رکھی ہے، اُس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کے معاملے میں خدا صرف اور صرف اپنی مرضی نافذ کرتا ہے۔ مرضی نافذ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ انسان کو صرف اُسی منزل (جنت یا دوزخ) کی طرف بڑھنے کی توفیق دیتا ہے، جس کے لیے خود اُس نے اُسے تخلیق کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ 'مالکِ یوم الدین' (انصاف کے دن کے مالک) کے پاس انصاف اور عدل نام کی کوئی چیز نہیں ہے، اُس کے پاس اگر کچھ ہے تو بس جبر ہی جبر ہے۔

تیسرا اعتراض یہ کہ اِس حدیث میں جس آیت کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بات کے حق میں بطورِ ثبوت پیش کیا ہے، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ بات سے واضح طور پر ٹکرا رہی ہے۔ آیت کا مفہوم تو یہ ہے کہ آدمی اپنے صحیح عقیدے اور نیک اعمال کی بنا پر جنت میں جائے گا اور اپنے باطل عقیدے اور بد اعمال کی بنا پر وہ دوزخ میں جائے گا، جب کہ اِس حدیث میں سراسر اس کے منافی بات بیان ہوئی ہے۔

حدیث کا مفہوم

تقدیر پر ایمان اگر خدا کے علمِ کامل (اِن اللّٰہ بکلِ شیء علیم) اور اُس کی قدرتِ کاملہ (اِن اللّٰہ علی کل شیء قدیر) پر ایمان کا لازمی نتیجہ ہے، تو پھر یہ ضروری ہے کہ اِس پر غور بھی بنیادی طور پر اِنھی دو صفات کے حوالے سے کیا جائے۔

چنانچہ ضروری ہے کہ پہلے اِس مسئلے کو حل کر لیا جائے کہ خدا کی صفتِ علم اور صفتِ قدرت کے حوالے سے آدمی کو اشکال کیوں اور کیسے پیدا ہوتا ہے۔ اِس اشکال کی وجہ دراصل یہ ہے کہ آدمی خدا کی صفتِ علم کو اپنی صفتِ علم پر قیاس کرتا اور خدا کے عالم ہونے کو اپنے عالم ہونے پر قیاس کرتا ہے۔ اِسی طرح وہ اُس کی صفتِ قدرت کو بھی انسانی محدودیتوں کا شکار خیال کرتا ہے۔ گو انسان یہ سمجھتا ہے کہ اللہ کی قوتیں اُس کی قوتوں سے بہت بڑی ہیں، لیکن بہر حال وہ انھیں انسانی نوعیت ہی کی قوتیں گمان کرتا ہے۔ حالانکہ اُس ذات کا معاملہ 'لیس کمثلہ شیئ' (کوئی چیز اُس کی مثل نہیں) ہے۔ اِس غلطی کی وجہ سے بے پناہ اشکالات پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ

یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کو انسانی صفات سے منزہ اور خدائی صفات سے متصف قرار دیا جائے اور اُس 'جل جلالہ' کے بارے میں اُنھی صفات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے غور کیا جائے، جو اُس کے شایانِ شان ہیں۔

اللہ 'عالِمُ الغیبِ وَ الشھادۃِ' ہے۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل کا علم یکساں طور پر رکھتا ہے۔ ہمارا علم ہمارے حواس کا محتاج ہوتا ہے۔ خدا کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ وہ بے شک 'سمیع و بصیر' بھی ہے۔ لیکن اُس کا 'عالِمُ الغیبِ وَ الشھادۃِ' ہونا، اُس کے 'سمیع و بصیر' ہونے کا محتاج نہیں ہے۔ اُس کا 'سمیع و بصیر' ہونا اپنی جگہ پر ہے اور 'عالم الغیب' ہونا اپنی جگہ پر۔ انسان کو غلطی یہاں سے لگتی ہے کہ وہ خدا کے بارے میں یہ سمجھتا ہے کہ جیسے میں سماعت و بصارت یا اپنے دوسرے حواس کے ذریعے سے علم حاصل کرتا ہوں، اِسی طرح وہ ذاتِ حق بھی اپنے 'سمیع و بصیر' ہونے کی بنا پر مستقبل کو کہیں موجود دیکھ کر جان لیتی ہو گی۔ مستقبل اگر پہلے سے کہیں موجود ہے، تو لازم ہے کہ وہ خدا کے جبر ہی سے قائم ہوا ہو۔ ... نہیں بات ایسے نہیں ہے۔ یہ خیال باطل ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ غیب کو اپنی ایک ایسی صفت کے ذریعے سے جان لیتا ہے، جس کا انسان کو کوئی تجربہ نہیں ہے۔ یہ صفت اُس کا 'عالِمُ الغیب' ہونا ہے۔ چنانچہ یہ فرض کرنا ہی غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ مستقبل کو پہلے کہیں حقیقتہً قائم کرتا ہے اور پھر اُسے دیکھ دیکھ کر وہ جانتا رہتا ہے۔ اِس وضاحت کے بعد اب ہم بہت آسانی سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ 'ما کان و ما یکون' کا علم رکھتا ہے اور اِس سے کوئی بھی جبر لازم نہیں آتا۔

اِس کے بعد اب آپ حدیث کی طرف آیئے۔ اِس میں پہلی بات یہ بیان ہوئی ہے کہ ''ہر آدمی کا ٹھکانا جنت یا دوزخ میں لکھا جا چکا ہے''۔

جنت یا دوزخ میں انسان کے ٹھکانے کا یہ لکھا جانا، محض خدا کے علمِ کامل کا ظہور ہے۔ اگر انسان کو خدا کے کامل علم یعنی اُس کے 'عالِمُ الغیب و الشھادۃ' ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہے، تو پھر اُس کے کامل علم کے ظہور پر بھی انسان کے لیے اصولاً کسی اعتراض کی گنجایش نہیں ہے۔ نہ خدا کا وہ علمِ کامل کسی جبر کو مستلزم ہے اور نہ اُس کا یہ ظہور کسی جبر کو لازم ٹھہراتا ہے۔

دوسری بات جو اِس حدیث میں بیان ہوئی ہے، وہ صحابہ کا یہ قول ہے کہ ''اے اللہ کے رسول کیا ہم اپنے بارے میں خدا کے اِس لکھے ہوئے پر بھروسا کر کے، عمل کی تگ و دو سے بے نیاز نہ ہو جائیں۔''

اِس کی وضاحت یہ ہے کہ خدا کا یہ لکھا ہوا اگر اُس کا کوئی جبری فیصلہ ہوتا، یعنی (نعوذ باللہ) خدا نے اگر بغیر

کسی اصول اور قانون کے اور بغیر کسی معیار کے، خالص اندھے پن سے لوگوں کے بارے میں یہ فیصلہ کیا ہوتا، تو وہ بات بالکل ہی ٹھیک تھی، جس کے لیے صحابہ نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت طلب فرمائی تھی، یعنی یہ کہ ہم کیوں نہ خدا کے لکھے ہوئے پر بھروسا کریں اور عمل کرنا چھوڑ دیں۔ اِس لیے کہ اگر معاملہ خدائی جبر کا ہے، تو پھر یہ یقینی بات ہے کہ سعیِ عمل ایک کارِ بے کار ہے اور اِس کا نتیجہ تحصیلِ حاصل کے سوا کچھ نہیں ہے۔ چنانچہ پھر انسان عمل کی تکلیف کاہے کو اٹھائے۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کو اِس کی بالکل اجازت نہیں دی کہ وہ عمل چھوڑ دیں، بلکہ آپ نے فرمایا، عمل کرتے رہو۔

تیسری بات جو اِس حدیث میں بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی بات سن کر فرمایا: ''ہر آدمی کو اُسی عمل کی توفیق دی جاتی ہے، جس کے لیے اُسے تخلیق کیا گیا ہے، چنانچہ اہلِ سعادت (جنتیوں) کو اعمالِ سعادت ہی کی توفیق دی جاتی ہے اور اہلِ شقاوت (دوزخیوں) کو اعمالِ شقاوت ہی کی توفیق دی جاتی ہے''۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اِس جواب سے دو اشکال پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اچھے یا بُرے اعمال کی بنا پر جنت یا جہنم میں نہیں ڈالنا، بلکہ اعمال سے قطع نظر انسان کی تخلیق اپنی ابتدا ہی سے جنت کے لیے ہوئی ہے یا جہنم کے لیے۔

۲۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جس انسان کو جنت کے لیے بنایا ہے، اُسے وہ اپنے جبری فیصلے سے نیک کاموں کی توفیق دیتا اور جنت میں لے جاتا ہے اور جسے دوزخ کے لیے بنایا گیا ہے، اُسے اپنے جبری فیصلے سے بُرے کاموں کی توفیق دیتا اور دوزخ میں لے جاتا ہے۔ انسان اصلاً بے بس ہے۔

یہ دونوں اشکالات صرف اِس صورت میں پیدا ہوتے ہیں جب کہ اِس حدیث کے الفاظ 'لما خلق له' (جس کے لیے اُسے تخلیق کیا گیا ہے) کا مفہوم غلط طے کر لیا جائے۔ 'لما خلق له' کا مفہوم یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اللہ نے ہر انسان کو اپنے جبری فیصلے سے جنت یا جہنم میں سے کسی ایک کے لیے پیدا کیا ہے۔ حالانکہ اِس کا مفہوم یہ نہیں ہے۔ اگر اِس مفہوم کو مان لیا جائے، تو پھر اللہ تعالیٰ کی اُن سب صفاتِ عالیہ اور اُس کے اُن سب اسماء حسنٰی کا انکار کرنا پڑتا ہے، جنھیں قرآنِ مجید بڑی شان کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اِس کے بعد نہ کوئی عدل باقی رہتا ہے اور نہ انصاف، نہ رحمت کی توقع کی جا سکتی ہے، نہ مغفرت کی امید۔ اِس صورت میں تو

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قیامت کی گھڑی، یقیناً، انسان کے دورِ ظلم کی انتہا اور اللہ کے 'دورِ ظلم' کی ابتدا قرار پاتی ہے۔

زیرِ بحث حدیث کا مفہوم اگر یہ نہیں ہے جو اِس سے سمجھا جا رہا ہے، تو پھر کیا ہے؟ آیئے حدیث کے الفاظ کی اِس مشکل کا حل قرآنِ مجید سے معلوم کرتے ہیں، کیونکہ وہ موضوعات جن پر قرآنِ مجید نے کلام کیا ہے، اُن میں مھیمن بھی وہی ہے، فرقان بھی وہی ہے اور میزان بھی وہی۔

زیرِ بحث حدیث کے الفاظ 'لما خلق له' (یعنی، جنت یا جہنم، جس کے لیے اُسے تخلیق کیا گیا ہے)، میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے، اِسی کو سورۂ اعراف کی آیت ۱۷۹ میں بھی بیان کیا گیا ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ اُس آیت ہی کی روشنی میں اِس حدیث کو حل کیا جائے۔ فرمایا:

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْراً مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ، لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا، وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَاّ يَسْمَعُونَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ، اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُونَ.

''اور ہم نے جنوں اور انسانوں میں سے بہت سوں کو دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے، اُن کے دل ہیں، جن سے وہ سمجھتے نہیں، اُن کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، اُن کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ یہ چوپایوں کے مانند ہیں، بلکہ اُن سے بھی زیادہ گمراہ ہیں، یہی لوگ ہیں جو بالکل بے خبر ہیں۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

آپ دیکھیے اِس آیت کا اسلوب وہی ہے، جو اسلوب زیرِ بحث حدیث میں اختیار کیا گیا ہے۔ حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ انسان کو جنت یا جہنم، جس کے لیے بھی وہ تخلیق کیا گیا ہو، اُسی کے مطابق اعمال کی توفیق دی جاتی ہے اور اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے بہت سے جنوں اور انسانوں کو جہنم کے لیے پیدا کیا ہے، اِس سے یہ بات تو خود بخود ظاہر ہے کہ اِن بہت سوں کے علاوہ کو جنت کے لیے پیدا کیا ہے۔ لہٰذا اِس آیت میں بھی وہی اسلوب اختیار کرتے ہوئے پوری بات کی گئی ہے جو اسلوب حدیث میں اختیار کیا گیا ہے۔ اللہ نے ایسا کیوں کیا ہے؟ آیت میں اِس کا جواب بھی واضح طور پر دے دیا گیا ہے۔ فرمایا کہ ہم نے انھیں جہنم کے لیے اِس وجہ سے پیدا کیا ہے کہ وہ سوچنے کی صلاحیت کے باوجود سوچتے نہیں، دیکھنے کی صلاحیت کے باوجود دیکھتے نہیں اور سننے کی صلاحیت کے باوجود سنتے نہیں۔ دل، آنکھوں اور کانوں کی صلاحیتوں سے کام نہ لینے سے مراد یہی ہے کہ یہ لوگ حق و باطل اور خیر و شر میں کوئی تمیز نہیں کرتے، ورنہ ظاہر ہے کہ بازار اور گھر کا راستہ تو ہر نیک و بد دیکھ

کر ہی چلتا ہے۔اصل مسئلہ حق و باطل اور خیر و شر میں تمیز ہی کا ہے۔درجِ بالا آیت ہمیں بتاتی ہے کہ خدا جہنم کے سپرد اُنھی لوگوں کو کرے گا جو خدا کی طرف سے سمجھنے والا دل، دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان تو لے کر آئیں گے ، مگر وہ اپنی خواہشات اور اپنے مفادات کی وجہ سے حق و باطل اور خیر و شر کے معاملے میں بالکل اندھے بن کر جئیں گے۔وہ دیکھنے کے موقع پر دیکھیں گے نہیں، سننے کے موقع پر سنیں گے نہیں اور سمجھنے کے موقع پر سمجھیں گے نہیں، پس یہ خدا کے غضب کا شکار ہوں گے اور جہنم میں جا پڑیں گے۔

اب آپ حدیث کے الفاظ سے پیدا ہونے والے اشکالات کی طرف آیئے اور دیکھیے کہ وہ اِس آیت کی روشنی میں بالکل حل ہو جاتے ہیں۔

پہلی بات یعنی یہ کہ ہر آدمی کا ٹھکانا جنت یا جہنم میں، لکھا جا چکا ہے۔

یہ لوگوں کے بارے میں اللہ کے ارادے کا نہیں، بلکہ اُس کے علمِ کامل کا ظہور رہے۔اُس نے جنت یا جہنم میں ٹھکانا لکھنے کا یہ معاملہ کسی بے جان پتھر جو نہ ارادہ رکھتا ہو اور نہ اختیار کے بارے میں نہیں کیا، بلکہ یہ لکھا جانا ایک ایسی مخلوق کے بارے میں ہے ، جسے اُس نے اختیار و ارادہ کی آزادی سے نوازا تھا،اِس کے ساتھ ہی یہ بات بھی اچھی طرح سے ذہن میں رہے کہ خدا انسان کو اختیار و ارادہ کی آزادی دینے میں ناکام نہیں رہا، اُس نے فی الواقع یہ آزادی اُسے عطا فرما دی ہے۔ہم جانتے ہیں کہ انسان اِس آزادی کو خوب 'Exercise' کرتا ہے۔ اِسی بنا پر دنیا بھر کی عدالتیں اُسے جرم پر سزا دیتی ہیں اور اِسی کی بنا پر اللہ نے انسان کو شریعت پر عمل کا مکلف ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ خدا کے علمِ کامل کا یہ ظہور کسی جبر کو مستلزم نہیں، یہ انسان کے بارے میں خدا کے کسی ارادے کا بیان نہیں ہے، بلکہ محض علم کا بیان ہے کہ کون خدا کی عطا کردہ اختیار و ارادہ کی آزادی کو استعمال کرتے ہوئے، اعمالِ سعادت اختیار کرے گا اور جنت میں جائے گا اور کون خدا کی عطا کردہ اختیار و ارادہ کی اِس آزادی کو استعمال کرتے ہوئے، اعمالِ شقاوت اختیار کرے گا اور دوزخ میں جائے گا۔خدا کا یہ علم ظاہر ہے کسی طرح بھی کسی جبر کو لازم نہیں کرتا۔جیسا کہ درجِ بالا آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے انھیں جہنم کے لیے اِس وجہ سے پیدا کیا ہے کہ یہ (خیر و شر کے معاملے میں) سوچنے کی صلاحیت کے باوجود سوچتے نہیں، دیکھنے کی صلاحیت کے باوجود دیکھتے نہیں اور سننے کی صلاحیت کے باوجود سنتے نہیں۔

دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ خود ہی جنتی شخص کو اعمالِ سعادت کی توفیق دیتا اور خود ہی جہنمی شخص کو اعمالِ شقاوت کی توفیق دیتا ہے۔

اِس کی وضاحت یہ ہے کہ جو شخص اپنی اختیار و ارادہ کی آزادی کو استعمال کرتے ہوئے، جنت میں جانے کا ارادہ کرتا اور اُس کے لیے نیک اعمال اختیار کرنا چاہتا ہے، اُسے اللہ نیک اعمال کی توفیق دیتا اور جو آخرت سے لاپروا ہو کر اعمالِ بد کو اختیار کرنا چاہتا ہے، اُسے اللہ اعمالِ بد کی توفیق دیتا ہے۔ اِسی بات کو اگر درج بالا آیت کے الفاظ میں بیان کیا جائے، تو ہم یہ کہیں گے کہ جو شخص اپنی سمع و بصر اور قلب کی صلاحیتوں کو خیر و شر میں تمیز کرنے اور حق و باطل میں فرق کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے اور پھر صحیح راہ اپنانا چاہتا ہے، وہی وہ شخص ہوتا ہے جسے اللہ نے جنت کے لیے پیدا کیا تھا، کیونکہ اُس کے بارے میں اللہ نے اپنے علمِ کامل کے ذریعے سے یہ جان لیا تھا کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ کو اپنی آزاد مرضی سے صحیح استعمال کرے گا اور نیک اعمال اختیار کر کے جنت میں جانا چاہے گا، چنانچہ یہ شخص دنیا میں جیسے جیسے اعمالِ صالحہ کو عملاً اختیار کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے، اللہ اِسے اعمالِ صالحہ کی توفیق دیتا چلا جاتا ہے۔ اِسی طرح جو شخص اپنی سمع و بصر اور قلب کی صلاحیتوں کو خیر و شر میں تمیز اور حق و باطل میں فرق کرنے کے لیے استعمال نہیں کرتا اور صحیح راستے کو نہیں اپناتا، وہ یقیناً وہی شخص ہوتا ہے، جس کے بارے میں اللہ نے اپنے علمِ کامل کے ذریعے سے جان لیا تھا کہ یہ اپنے اختیار و ارادہ کو اپنی آزاد مرضی سے غلط استعمال کرے گا اور بد اعمال اختیار کرتے ہوئے دوزخ کی راہ پر چلنا چاہے گا، چنانچہ اُس کو اللہ نے دوزخ ہی کے لیے پیدا کیا تھا، پھر دنیا میں جیسے جیسے اُس کی طرف سے اعمالِ بد اختیار کرنے کا ارادہ نظر آتا چلا جاتا ہے، اللہ اُسے اعمالِ بد کی توفیق دیتا چلا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ظاہر ہے کہ ایسا ہی کرنا چاہیے تھا، ورنہ اُس کی طرف سے انسان کے معاملے میں جبر لازم آتا، کیونکہ اختیار و ارادہ کی آزادی کے بعد صحیح اور حق بات یہی تھی کہ خدا ایسا ہی کرے۔

تیسرا اشکال یہ بیان کیا گیا ہے کہ اِس حدیث میں جس آیت کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بات کے حق میں بطورِ ثبوت پیش کیا ہے، وہ آپ کی بیان کردہ بات سے واضح طور پر ٹکرا رہی ہے۔ آیت کا مفہوم تو یہ ہے کہ آدمی اپنے صحیح عقیدے اور نیک اعمال کی بنا پر جنت میں جائے گا اور اپنے باطل عقیدے اور بد اعمال کی بنا پر دوزخ میں جائے گا، جب کہ اِس حدیث میں سراسر اس کے منافی بات بیان ہوئی ہے۔

اوپر ہم نے یہ واضح کر دیا ہے کہ حدیث میں بیان کردہ بات بالکل وہی ہے جو آیت میں بیان ہوئی ہے، یعنی آدمی اپنے صحیح عقیدے اور نیک اعمال ہی کی بنا پر جنت میں جائے گا اور اپنے باطل عقیدے اور بد اعمال ہی کی بنا پر وہ دوزخ میں جائے گا۔

خلاصۂ بحث

اب ہم زیرِ بحث حدیث کو اُس کے اُن سب محذوفات و مقدرات کے ساتھ بیان کیے دیتے ہیں، جنھیں ہم نے اِس ساری بحث میں کھولا ہے، اِس لیے کہ یہی خلاصۂ بحث ہے۔

"علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اُنھوں نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے، جس کا ٹھکانا (اللہ کے علمِ کامل کی بنا پر) دوزخ یا جنت میں لکھ نہ دیا گیا ہو۔ لوگوں نے کہا: اے اللہ کے رسول، کیا ہم اپنے بارے میں خدا کے لکھے ہوئے پر بھروسا کر کے، عمل کی تگ و دو سے بے نیاز نہ ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا: عمل کرتے رہو (خدا کا یہ لکھنا اُس کی طرف سے کوئی جبر نہیں ہے کہ تمھارا عمل سے گریز کرنا درست فیصلہ قرار پائے)۔ (دیکھو) ہر آدمی کو (جب کہ وہ اِس دنیا میں خالص اپنی مرضی سے آزادی اختیار و ارادہ کو استعمال کرتے ہوئے کسی عمل کو اختیار کرنا چاہتا ہے تو) اُسی عمل کی توفیق دی جاتی ہے، جس کے لیے (خدا کے علمِ کامل کی بنا پر) اُسے تخلیق کیا گیا ہے (ظاہر ہے یہ وہی عمل ہوتا ہے جسے اُس نے اپنے اختیار و ارادہ کو اپنی آزاد مرضی سے استعمال کرتے ہوئے اختیار کرنا تھا)، چنانچہ اہلِ سعادت (جنتیوں) کو اعمالِ سعادت ہی کی توفیق دی جاتی ہے (کیونکہ وہ اپنی آزاد مرضی سے اِنھی اعمال کو اختیار کرتے ہیں) اور اہلِ شقاوت (دوزخیوں) کو اعمالِ شقاوت ہی کی توفیق دی جاتی ہے (کیونکہ وہ اپنی آزاد مرضی سے اِنھی اعمال کو اختیار کرتے ہیں)۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (اِس بات پر قرآن سے دلیل لاتے ہوئے سورۂ لیل کی یہ آیت) پڑھی: "سو جس نے انفاق کیا اور پرہیز گاری اختیار کی اور اچھے انجام کو سچ مانا، تو اُسے ہم راحت کی منزل (جنت) کا اہل بنائیں گے (اِسی طرح کے لوگوں کا ٹھکانا اللہ نے اپنے علمِ کامل کی بنا پر جنت میں لکھا ہوا ہے)، اور جس نے بخل کیا اور بے پروا ہوا اور اچھے انجام کو جھٹلایا، اُس کو ہم کٹھن منزل (دوزخ) کی طرف بڑھنے کے لیے ڈھیل دیں گے (اِسی طرح کے لوگوں کا ٹھکانا اللہ نے اپنے علمِ کامل کی بنا پر دوزخ میں لکھا ہوا ہے)۔"

یہاں مزید ایک بات کی وضاحت کر دینا موزوں ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو تخلیق کرنے کے بعد آزمایش کے اِس عمل میں کیوں ڈالا ہے، اِس سے خدا کے پیشِ نظر کیا ہے۔

سورۂ یونس کی آیت ۴ میں اِس بات کو اِس طرح سے واضح کیا گیا ہے:

اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ،

"بے شک وہی خلق کا آغاز کرتا ہے، پھر وہی اِس کا اعادہ کرے گا، تا کہ جو لوگ ایمان لائے اور

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِنْ حَمِيْمٍ وَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوا يكفرون.

اُنھوں نے نیک کام کیے اُن کو عدل کے ساتھ بدلہ دے اور جنھوں نے کفر کیا اُن کے لیے اُن کے کفر کی پاداش میں کھولتا پانی اور درد ناک عذاب ہے۔"

اِس آیت میں یہ بات بہت واضح الفاظ میں بتادی گئی ہے کہ اللہ نے انسانوں کی تخلیق اور اُس کے بعد انھیں آزمایش سے گزارنے کا یہ سارا عمل کیا ہی اِس لیے ہے کہ اہلِ ایمان کو نیک اعمال کا بدلہ دیا جائے۔ یعنی خدا نے آزمایش کی یہ دنیا بنائی ہی اِس لیے ہے تاکہ وہ اہلِ ایمان کو جنت میں لے جائے۔ یہ اِس لیے نہیں بنائی گئی تاکہ کچھ لوگوں سے دوزخ کو آباد کیا جائے اور کچھ لوگوں سے جنت کو۔ البتہ چونکہ آزادیِ اختیار و ارادہ کے نتیجے میں کفر کرنے والے لوگ بھی ہوں گے، لہٰذا، انھیں اُن کی بد عملی کی پاداش میں دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ انھیں دوزخ میں بھیجنا خدا کے مقاصد میں سے کوئی مقصد نہیں تھا، بلکہ اہلِ کفر کی یہ سزا اہلِ ایمان کی جزا کے لوازم و توابع میں سے ہے۔ اِس کی مثال یہ ہے کہ بے شک اسکول بچوں کو تعلیم یافتہ بنانے کے لیے کھولے جاتے ہیں۔ بچے اُن میں تعلیم پاتے اور امتحان دیتے ہیں۔ نتیجۃً کچھ بچے کامیاب ہوتے اور کچھ ناکام ہوتے ہیں۔ اسکول کا وجود اور امتحانی نظام گو کچھ بچوں کی کامیابی اور کچھ کی ناکامی کا ذریعہ بنتا ہے، لیکن کسی صورت میں بھی اسکول کا مقصد یہ قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اِس سے ہمارے پیشِ نظر قوم کے کچھ بچوں کو کامیاب بنانا اور کچھ کو ناکام بنانا ہے۔ اسکول کا مقصد ہمیشہ یہی بیان کیا جاتا ہے اور صحیح بیان کیا جاتا ہے کہ وہ قوم کے افراد کو تربیت دینے کے لیے وجود میں لایا گیا ہے، تاکہ بچے اُس میں تعلیم پائیں اور کامیاب ہوں۔

چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو آزمایش کی اِس دنیا میں بھیجا ہی اِس لیے گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو اُن کے نیک اعمال کا بدلہ دے۔ اِس لیے نہیں بھیجا گیا کہ اللہ کچھ لوگوں سے جنت کو آباد کرے اور کچھ لوگوں سے دوزخ کو۔ دوزخ کو آباد کرنا خدا کے پیشِ نظر مقاصد میں سے ہے ہی نہیں۔ کفر کرنے والے تو محض اپنی بد عملی کی پاداش میں دوزخ میں جا گرتے ہیں۔

هذا ما عندی و العلم عند الله۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

میزان

جاوید احمد غامدی

قانونِ جہاد

(۱)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

جہاد کے معنی کسی جدوجہد میں پوری قوت صرف کر دینے کے ہیں۔ قرآن میں یہ تعبیر جس طرح اللہ کی راہ میں عام جدوجہد کے لیے استعمال ہوئی ہے، اسی طرح قتال فی سبیل اللہ کے لیے بھی جگہ جگہ آئی ہے۔ یہاں اس کا یہی دوسرا مفہوم پیشِ نظر ہے۔ امن اور آزادی انسانی تمدن کی ناگزیر ضرورت ہے۔ فرد کی سرکشی سے اس کی حفاظت کے لیے تادیب اور سزائیں ہیں، لیکن اگر قومیں شوریدہ سر ہو جائیں تو ہر شخص جانتا ہے کہ اُن کے خلاف تلوار اٹھانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ نصیحت اور تلقین جب تک کار گر ہو، تلوار اٹھانے کو کوئی شخص بھی جائز قرار نہ دے گا، مگر جب کسی قوم کی سرکشی اور شوریدہ سری اس حد کو پہنچ جائے کہ اسے نصیحت اور تلقین سے صحیح راستے پر لانا ممکن نہ رہے تو انسان کا حق ہے کہ اس کے خلاف تلوار اٹھائے اور اُس وقت تک اٹھائے رکھے، جب تک امن اور آزادی کی فضا دنیا میں بحال نہ ہو جائے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ تلوار اٹھانے کی یہ اجازت اگر نہ دی جاتی تو قوموں کی سرکشی اس انتہا کو پہنچ جاتی کہ تمدن کی بربادی کا تو کیا ذکر، معبد تک ویران کر دیے جاتے ہیں اور اُن جگہوں پر خاک اڑتی، جہاں اب شب و روز اللہ پروردگارِ عالم کا نام لیا جاتا اور اس کی عبادت کی جاتی ہے:

وَلَوۡلَا دَفۡعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ لَّهُدِّمَتۡ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ

''اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے دفع نہ کرتا تو خانقاہیں، گرجے، معبد اور مسجدیں

يُذۡكَرُ فِيۡهَا اسۡمُ اللّٰهِ كَثِيۡرًا.(الحج ٢٢: ٤٠)

جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے، سب ڈھا دیے جاتے۔‘‘

جہاد کا حکم قرآن میں دو صورتوں کے لیے آیا ہے:

ایک ظلم و عدوان کے خلاف،

دوسرے اتمامِ حجت کے بعد منکرینِ حق کے خلاف۔

پہلی صورت شریعت کا ابدی حکم ہے اور اس کے تحت جہاد اُسی مصلحت سے کیا جاتا ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ دوسری صورت کا تعلق شریعت سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ اتمامِ حجت سے ہے جو اس دنیا میں ہمیشہ انھی لوگوں کے ذریعے سے روبہ عمل ہوتا ہے جنھیں اللہ تعالیٰ ''شہادت'' کے منصب پر فائز کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حق کی ایسی گواہی بن جاتے ہیں کہ اس کے بعد کسی کے لیے اُس سے انحراف کی گنجایش باقی نہیں رہتی۔ انسانی تاریخ میں یہ منصب آخری مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرام کو حاصل ہوا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيۡدًا.(البقرہ ٢: ١٤٣)

''اور اسی طرح پیغمبر کے ساتھیو، ہم نے تمھیں درمیان کی جماعت[1] بنایا تاکہ تم دنیا کی اقوام پر (اِس دین کی) شہادت دینے والے بنو اور پیغمبر تم پر یہ شہادت دے۔''

اس قانون کی رو سے اللہ کی حجت جب کسی قوم پر پوری ہو جاتی ہے تو اس کے منکرین پر اسی دنیا میں عذاب آ جاتا ہے۔ یہ عذاب آسمان سے بھی آتا ہے اور بعض حالات میں اہلِ حق کی تلواروں کے ذریعے سے بھی۔ پھر اس کے نتیجے میں منکرین لازماً مغلوب ہو جاتے ہیں اور اُن کی سرزمین پر حق کا غلبہ پوری قوت کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی طرف سے اتمامِ حجت کے بعد یہی دوسری صورت پیش آئی۔ چنانچہ انھیں جس طرح ظلم و عدوان کے خلاف قتال کا حکم دیا گیا، اسی طرح اس مقصد کے لیے بھی تلوار اٹھانے کی ہدایت ہوئی۔ یہ خدا کا کام تھا جو انسان کے ہاتھوں سے انجام پایا۔ اسے ایک سنتِ الٰہی کی حیثیت

۱۔ اس معنی میں کہ تمھارے ایک طرف اللہ کا رسول اور دوسری طرف 'الناس'، یعنی دنیا کی اقوام ہیں۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

سے دیکھنا چاہیے۔ انسانی اخلاقیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ 'یعذبھم اللّٰہ بایدیکم'[2] (اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے سزا دے گا) کے الفاظ میں یہی حقیقت بیان ہوئی ہے۔

ذیل میں ہم جہاد کی ان دونوں صورتوں سے متعلق قرآن کے نصوص کی وضاحت کریں گے۔

(باقی)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۲۔ التوبہ ۹: ۱۴۔

محمد اسلم نجمی

سبعۃ احرف

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ابتدائی دور میں مشرکینِ بنی اسماعیل اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ اسلام کی دعوت ایک کمزور دعوت ہے اس لیے یہ وقت کے ساتھ آپ سے آپ ختم ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے پیروکاروں اور قرآنِ مجید کو طنز و تعریض اور استہزا و مذاق کا نشانہ بنانے پر اکتفا کیا۔ مگر بظاہر ناسازگار حالات کے باوجود، جلد ہی انھیں احساس ہو گیا کہ ان کا اندازہ غلط تھا۔ یہ دعوت نہ صرف یہ کہ پھیلتی جا رہی تھی بلکہ اس کا مستقبل بھی نہایت تاب ناک دکھائی دے رہا تھا۔ اس بنا پر انھوں نے اب سنجیدگی سے اسلام کے خلاف منصوبہ بندی کی ضرورت محسوس کی اور اپنی حکمتِ عملی تبدیل کر لی۔ اپنے اہالی و موالی کو پیغمبر اور اسلام کے اثرات سے بچانے کے لیے اب انھوں نے بہتان طرازیوں کی راہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے ساتھ ہی ان غلاموں اور زیردستوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

مشرکینِ مکہ کی معاندانہ سرگرمیوں کے پیچھے اہلِ کتاب کی سازشیں کارفرما تھیں۔ نبوت بنی اسرائیل سے بنی اسماعیل میں منتقل ہو جانے اور آخری نبی کے امیین میں سے مبعوث ہونے کو اہلِ کتاب اپنی تذلیل سمجھتے اور دل سے چاہتے تھے کہ اسلام قلوب و اذہان میں جگہ نہ بنا سکے۔ اس لیے انھوں نے ابتداً قریشِ مکہ کو آلۂ کار بنا کر اپنے عزائم پورے کرنے کی کوشش کی مگر ان کی سازش کامیاب نہ ہو سکی اور اسلام فطری رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ اسی دوران میں ہجرت کا وقت آن پہنچا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک فرماں روا کی حیثیت سے یثرب میں داخل ہوئے۔ اب اسلام کی دعوت ایک نئے مرحلے میں داخل ہو گئی تھی۔ اسلام کو فروغ پانے کے لیے اقتدار

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اور اہلِ ایمان کو اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کے لیے ایک خطۂ زمین میسر آ گیا تھا۔ چنانچہ اہلِ کتاب کی درپردہ سازشوں میں اضافہ ہو گیا۔ ایک طرف اہلِ مکہ نے اسلام قبول کرنے والوں پر ظلم و ستم میں اضافہ کر دیا اور دوسری جانب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں ترمیم کرنے اور مشرکین بنی اسماعیل اور اہلِ کتاب کو مطمئن کرنے کے لیے ناجائز تجاویز پیش کرنا شروع کر دیں۔

مکہ میں اسلام قبول کرنے والوں کو صبر و مصابرت اور (موقع ملتے ہی) ہجرت کی راہ اختیار کرنے کی تلقین کی گئی اور اہلِ کتاب کو احساس دلانے کی کوشش کی گئی کہ ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑ کر سچے دل سے اسلام قبول کر لینے ہی میں ان کی عافیت ہے، مگر اسلام کے مخالف یہ دونوں گروہ نہ صرف اپنی پرانی روش پر قائم رہے بلکہ ان کی مخالفت میں مزید شدت پیدا ہو گئی۔ اسی دوران میں مشرکینِ مکہ کو مدینہ پر حملہ آور ہونے کا موقع میسر آ گیا۔ اپنے تجارتی قافلے کی حفاظت کا بہانہ بنا کر انھوں نے مسلمانوں پر چڑھائی کر دی۔ غزوۂ بدر کا معرکہ برپا ہوا۔ یہ جنگ جیتنے کے لیے اہلِ مکہ نے اپنی ساری توانائیاں صرف کیں اور پورے وسائل استعمال کیے مگر انھیں شکستِ فاش ہوئی۔ اس جنگ میں ان کی کم و بیش ساری لیڈر شپ قتل ہو گئی۔ انھوں نے شکست کا بدلہ لینے کے لیے پھر سے تیاری شروع کر دی۔ ۴ ہجری کو غزوۂ احد میں مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کا پھر آمنا سامنا ہوا۔ اس معرکے میں اگرچہ اہلِ مکہ کا پلہ بھاری تھا مگر وہ نامعلوم وجوہ کی بنا پر مسلمانوں کی شکست کو منطقی انجام تک پہنچائے بغیر، عین حالتِ جنگ میں میدان چھوڑ کر راہ فرار اختیار کر گئے اور فتح کے واضح آثار کے باوجود وہ شکست خوردگی کے احساس کے ساتھ لوٹ گئے، جنگِ احد کے بعد انھوں نے محسوس کر لیا کہ تنہا مسلمانوں کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں، اس لیے انھوں نے اہلِ کتاب (بالخصوص یہود) کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر فیصلہ کن ضرب لگانے کی منصوبہ بندی کی۔ قریشِ مکہ، یہود اور دیگر عرب قبائل نے مل کر ۵ ہجری میں پھر مدینہ پر چڑھائی کر دی۔ مسلمان شہر کے گرد خندق کھود کر قلعہ بند ہو گئے۔ اس جنگ میں بھی اسلام دشمنوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس جنگ کے بعد مشرکینِ مکہ میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہ رہی البتہ یہودیوں میں ابھی دم خم باقی تھا مگر فتح خیبر کے بعد ان کا زور بھی ٹوٹ گیا۔ اسی دوران میں مکہ فتح ہو گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فاتح کی حیثیت سے حرم کعبہ میں داخل ہوئے۔ رسولوں کے بارے میں اللہ کی سنت پوری ہو گئی اور جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کے سوا کسی اور دین کے لیے جائے پناہ باقی نہ رہی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہوئے۔ ان

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کے دور میں بہت سے فتنے اٹھے جن سے بظاہر محسوس ہوتا تھا کہ اسلام کی ناؤ ڈانواں ڈول ہے مگر شورشی قبائل کی سرکوبی، مدعیانِ نبوت کے استیصال، خود سر مرتد امرا کی بیخ کنی اور منکرینِ زکوٰۃ کی تادیب کے بعد اسلام اور اہلِ اسلام اس بحرانی دور سے نہایت کامیابی کے ساتھ گزر گئے۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر کے دور میں اسلامی فتوحات کا دروازہ کھل گیا۔ انھی کے دور میں ایران فتح ہوا۔ ایرانی مجوسیوں کو اپنی ذلت آمیز شکست کا بڑا دکھ تھا۔ وہ اسلام کے مخالف ہو گئے۔ مشرکینِ عرب کی قوت ختم ہو چکی تھی۔ اسلام کی مخالفت میں اہلِ کتاب تنہا رہ گئے تھے۔ ایران کی شکست کے بعد انھیں مجوسیوں کی شکل میں ایک اچھا حلیف میسر آ گیا۔ ان دونوں گروہوں کی پشت پناہی سے ایک مجوسی غم ابولولو فیروز نے خلیفہ ثانی حضرت عمر کو شہید کر دیا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش اور ان کی شہادت بھی یہود و مجوس کی ملی بھگت اور سازشوں کا نتیجہ تھی۔ حضرت علی کے دورِ خلافت میں اسلامی قلم رو میں انتشار و بدامنی جنگِ جمل و صفین حضرت علی کی شہادت اور ان کے بعد سانحۂ کربلا جیسے واقعات انھی فتنہ پردازوں کی سازشوں کا نتیجہ تھے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اس ساری دراز نفسی کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اتنے جاں گسل اور ہنگامہ خیز حالات میں بھی مسلمانوں کا اجتماعی ملی تشخص پوری شان کے ساتھ برقرار رہا۔ منافقین، ملاحدہ اور یہود و مجوس نے ناسازگار حالات کے باوجود اسلام کی اصولی حیثیت میں ذرہ برابر فرق نہ آنے سے یہ نتیجہ نکالا کہ مسلمانوں میں انتشار کا بیج بونے، ان کی مرکزیت کو ختم کرنے اور انھیں مذہبی گروہ بندیوں کا شکار کرنے کے لیے انھیں قرآنِ مجید سے دور کرنا ضروری ہے۔ اللہ کی یہ رسی جب تک ان کے ہاتھوں میں رہے گی ان کا زوال پذیر ہونا ممکن نہیں۔ چنانچہ اپنے اس مذموم مقصد کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے نہایت غور و فکر کے بعد جو حکمتِ عملی ترتیب دی، اس کے تحت سب سے اہم بات جو انھوں نے پیشِ نظر رکھی وہ یہ تھی کہ مسلمانوں میں قرآن کی مرکزیت ختم کر دی جائے اور اس کی میزان اور فرقان ہونے کی حیثیت باقی نہ رہے۔ اس کے لیے یہ بات عام کر دی جائے کہ قرآن بعینہٖ وہ نہیں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا اور اس میں کسی بھی درجے میں سہی کمی بیشی ضرور ہوئی ہے۔

یہ ایک کرب ناک حقیقت ہے کہ ان کی یہ سازش ایک درجے میں کامیاب ہو گئی اس کے لیے انھوں نے بڑا محتاط اور محفوظ راستہ اختیار کیا۔ انھوں نے بڑی جامع منصوبہ بندی کی اور اپنے درپردہ مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے احادیث کے شعبے کو کمین گاہ بنا کر قرآن پر حملہ آور ہوئے۔ پہلے آثار و روایات کی ضرورت اور

اہمیت کو اس قدر بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا کہ قرآن پس منظر میں چلا گیا۔ حدیث کی مشکلات کو قرآن کی روشنی میں حل کرنے کے بجائے قرآن کو روایات کی روشنی میں سمجھنے کا رجحان پیدا کیا گیا اور رفتہ رفتہ حدیث قرآن پر حکم بنا دی گئی۔ اس کے بعد قرآن کو محرف ثابت کرنے کے لیے کثیر تعداد میں ایسی روایات وضع کر کے پھیلا دی گئیں جن میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ قرآن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بین الدفتین جمع نہ ہوا تھا۔ جمع قرآن جیسا اہم ترین کام آپ کی رحلت کے بعد دورِ صدیقِ اکبر میں حضرت عمر کی تجویز پر صحابۂ کرام اور عامتہ المسلمین کے تعاون سے حضرت زید بن ثابت کے ذریعے سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس لیے سورتوں اور آیات کی ترتیب و تدوین میں بعض جگہ ظن و تخمین اور اجتہاد سے کام لینا پڑا۔ بعض آیات بڑی مشکل سے ایک آدھ شخص کے پاس سے ملیں۔ کچھ صحابہ نے اپنے طور پر قرآن جمع کر رکھا تھا جو حضرت زید بن ثابت کے جمع کردہ نسخے سے مختلف تھا۔ انھوں نے اپنے مصاحف کے مقابل میں مصحف اکبر کی حیثیت عرفی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ آیات کی تعداد اور سورتوں کی ترتیب میں بھی اختلافات تھے۔ یہ ساری تفصیلات ہمارے مستند مذہبی لٹریچر اور معتبر تاریخی کتب میں موجود ہیں، جنھیں اختلافِ قراءت کے حسین لبادے میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان قراءتوں میں اعراب، حروف، الفاظ اور جملوں کا ایسا اختلاف بیان ہوا ہے جس سے آیات کی ہیئت ترکیبی اور معانی میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک حدیث وہ ہے جس میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن سات قراءتوں میں نازل ہوا تھا۔ یہ روایت احادیث کے کم و بیش سبھی مستند ذخیروں میں موجود ہے۔ صحیح بخاری میں یہ روایت کتاب فضائل القرآن، کتاب التوحید اور کتاب استتابتہ المرتدین میں آئی ہے۔ روایت یہ ہے:

من ابن شهاب قال حدثني عروة بن الذبير ان المسور ابن المخرمة وعبد الرحمان بن عبد القاری حدثاه انهما سمعا عمر ابن الخطاب يقول سمعت هشام بن حكيم يقرء سورة الفرقان فی حياة رسول الله صلى الله عليه وسلم. فاستمعت لقراته فاذا هو يقرء على حروف كثيرة لم يقرءنيها رسول الله

''ابنِ شہاب سے روایت ہے: عروہ بن زبیر نے مجھے بتایا کہ مسور بن مخرمہ اور عبدالرحمان بن عبدالقاری نے حضرت عمر بن الخطاب سے سنا، وہ بیان کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں، میں نے ہشام بن حکیم کو سورۂ فرقان پڑھتے سنا۔ میں نے ان کی قراءت غور سے سنی تو معلوم ہوا کہ وہ متعدد ایسی طرزوں سے پڑھ رہے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

صلى الله عليه وسلم فكدت اساوره فى الصلوة فتصبرت حتى سلم فلببته بردائة فقلت من اقراک هذه السورة التى سمعتک تقرء قال اقراءنيها رسول الله صلى الله عليه وسلم فقلت كذبت فان رسول الله صلى الله عليه وسلم قد اقرءنيها على غير ما قرات فانطلقت به اقود الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقلت انى سمعت هذا يقرء بسورة الفرقان على حروف لم يقرأنيها فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ارسله. اقرءيا هشام قرءعليه القراة التى اقرءنى فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم كذالک انزلت ان هذا القرآن انزل على سبعة احرف فاقرءوا ما تيسر منه.

(بخاری، کتاب فضائل القرآن)

نہیں پڑھائی تھیں۔ میں نماز ہی میں ان پر جھپٹنا چاہتا تھا (مگر میں ایسا نہیں کر سکا) اور میں نے بمشکل ضبط کیا یہاں تک کہ انھوں نے سلام پھیرا۔ میں نے انھی کی چادر ان کے گلے میں ڈالی اور پوچھا کہ یہ سورت جو میں نے تمھیں پڑھتے سنا ہے یہ تمھیں کس نے پڑھائی تھی ؟ انھوں نے جواب دیا کہ یہ مجھے رسول اللہ نے پڑھائی تھی۔ میں نے کہا تم جھوٹ بولتے ہو کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس طرز سے مختلف انداز میں پڑھائی تھی۔ جس طرز سے تم نے پڑھی ہے پھر میں ان کو کھینچتا ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گیا اور عرض کی کہ اس شخص کو میں نے سورۂ فرقان ایسی طرزوں سے پڑھتے ہوئے سنا ہے جو آپ نے مجھے نہیں پڑھائی تھیں اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس شخص کو چھوڑ دو (اور پھر ارشاد فرمایا) اے ہشام پڑھو: ہشام نے اسی طرح پڑھا جس طرح میں نے انھیں پڑھتے سنا تھا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ اسی طرح نازل ہوئی تھی۔ پھر فرمایا: عمر تم پڑھو۔ میں نے آپ کو اسی طرح پڑھ کر سنایا جیسے آپ نے مجھے پڑھایا تھا۔ اس پر رسول اللہ نے فرمایا: یہ سورہ اسی طرح نازل ہوئی (اس کے بعد آپ نے مزید ارشاد فرمایا) یہ

قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے اس میں سے
جتنا میسر ہو سکے پڑھ لیا کرو۔‘‘

پہلے اس روایت کی سند کو لیجیے: مسلم اور ترمذی میں بھی اس کی سند یہی ہے۔ دوسری کتب حدیث میں اس کی مویدات عام طور پر کمزور سندوں کے ساتھ روایت ہوئی ہیں۔ اس لیے کسی دوسرے واسطے سے اس روایت کو زیادہ تقویت نہیں ملتی۔ لہٰذا اس حدیث کا قوی ترین طریق یہی ہے۔

اسے روایت کرنے والے مسور بن مخرمہ (صحابی) اور عبد الرحمان بن عبد القاری (تابعی) ہیں۔ حیرت ہے کہ اتنی اہم بات وہ اپنے شاگردوں میں سے کسی اور کے سامنے بیان نہیں کرتے اور عروہ کی احتیاط کا عالم یہ ہے کہ وہ ادراج، ارسال اور تدلیس کی صفات کے حامل ابنِ شہاب زہری ہی کو اپنا محرم راز بتاتے ہیں اور ان کے سوا کسی دوسرے کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دیتے۔ البتہ ابنِ شہاب نے اپنے تمام معتمد علیہ شاگردوں (مثلاً عقیل، شعیب، یونس، مالک، معمر وغیرہ) کے سامنے پورے اعتماد کے ساتھ یہ حدیث بیان کی اور انھوں نے حقِ شاگردی ادا کرتے ہوئے اس روایت کو عام کرنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔

ابنِ شہاب زہری نے خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز کی وفات کے بعد دوسری صدی ہجری میں جمعِ حدیث کے کام کا آغاز کیا۔ گویا یہ روایت دوسری صدی ہجری میں پہلی مرتبہ منصۂ شہود پر آئی۔ پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن اگر سات قراءتوں پر نازل ہوا تھا تو قراءتِ عامہ کے علاوہ باقی چھ قراءتوں کا دور دور تک پتا کیوں نہیں ملتا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ وہ قراءتیں کیا ہوئیں اور کہاں گئیں؟ ان سوالوں کا جواب مشہور مورخ اور مفسر ابنِ جریر طبری نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں دیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خلیفۂ ثالث حضرت عثمانِ غنی نے قرآن میں اختلافات سے بچنے کے لیے بتقاضائے مصلحت صحابۂ کرام کے مشورے سے قرآن مجید کو لغت قریش پر باقی رکھا اور اس کے سوا دوسری قراءتوں سے امت کو روک دیا اور ان مصاحف کو بھی ضائع کرا دیا جو قراءتِ عامہ کے سوا دیگر قراءتوں میں تھے، اس لیے چھ قراءتیں دنیا سے محو ہو گئیں اور صرف ایک ہی قراءت باقی رہی جو معروف و متداول ہے۔ ابنِ جریر ۳۱۰ ہجری میں فوت ہوئے گویا دوسری صدی ہجری میں اس انکشاف کے باوجود کہ قرآن سات قراءتوں پر نازل ہوا، تیسری صدی ہجری تک ایک ہی قراءت رائج تھی۔ لوگ قراءتِ عامہ کے سوا کسی دوسری قراءت سے واقف نہ تھے۔

ابنِ جریر کی یہ توجیہ اگرچہ بجائے خود محلِ نظر ہے مگر ہم فرض کر لیتے ہیں کہ اگر امرِ واقعہ میں ایسا ہی ہے تو

سوال یہ ہے کہ حضرت عثمان کو یہ حق کس نے دیا کہ وہ ('ما انزل من ربک' میں سے) چھ قراءتوں کو منسوخ کر دیں جب کہ یہ حق خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حاصل نہ تھا۔

ابنِ جریر کی وضاحت میں مصلحتِ وقت اور صحابۂ کرام کے مشورے کو قراءتوں کا ناسخ قرار دیا گیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس تاویل سے تحریفِ قرآن کے قائلین کے موقف کو موکد کرنا پیشِ نظر ہو؟

حدیث کے متن پر غور کیجیے تو کچھ اور سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

۱۔ روایت میں بیان ہوا ہے کہ قرآن سات قراءتوں پر اترا۔ اس کے لیے متن میں 'انزل' کا صیغہ نقل ہوا ہے۔ بعینہٖ اسی صیغے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی ذمہ داری بیان ہوئی ہے۔

يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ. (المائدہ ۵: ۶۷)

''اے رسول جو چیز تمھاری طرف تمھارے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے، اس کو اچھی طرح پہنچادو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قرآن اگر فی الواقع سات قراءتوں میں نازل ہوا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی منصبی ذمہ داری تھی کہ وہ قرآن ہی کی طرح اس کی سات قراءتوں کو امت تک منتقل کرتے، مگر ایسا نہیں ہوا۔ قراءت سبعہ کے قائلین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ قراءتِ عامہ کے سوا باقی قراءتوں کا دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے۔ اس صورتِ حال میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ رسالت کی ذمہ داریاں پوری ہو گئیں؟ اور کیا آپ نے اللہ کا پیغام تمام لوازم ولواحق کے ساتھ بلا کم وکاست پہنچا دیا؟

۲۔ قرآن کے سات قراءتوں پر نازل ہونے کا صاف مطلب یہ ہے کہ محدود مدت کے لیے ہی سہی، ان قراءتوں کے مطابق لازماً قرآن پڑھا گیا ہوگا۔ کیا اس معاملے میں کسی ایک آیت کی سات قراءتیں پیش کی جاسکتی ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے قرآن کی عظمت اور اس کے شرف کو بیان کرتے ہوئے دو پہلوؤں کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔ ایک یہ کہ قرآن ہر اعتبار سے محفوظ ہے اس کے بھیجنے والے اللہ تعالیٰ لانے والے جبرئیلِ امین، وصول کرنے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اخذ و حکایت کرنے والے خلق کے پاکیزہ ترین اخیار و صالحین ہیں۔ ان میں کہیں بھی شیطان (یا کسی اور) کی دراندازی کے لیے کوئی راستہ نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ اس کی حفاظت کا انتظام خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ قرآنِ مجید میں یہ مضمون ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۣ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ. (حٰم السجدہ ۴۱: ۴۲)

''اس میں باطل نہ اس کے آگے سے داخل ہو سکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے، یہ (کتاب) خدائے حکیم و حمید کی طرف سے نہایت اہتمام کے ساتھ اتاری گئی ہے۔''

اس پر مستزاد یہ کہ اس کی حفاظت و ترتیب کی ذمہ داری بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی ہے:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ. اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ. فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ. ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ. (القیامہ ۷۵: ۱۶-۱۹)

''اس کو جلدی سیکھ لینے کے لیے اس کے پڑھنے پر اپنی زبان کو تیز حرکت نہ دو، ہمارے ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو سنانا تو جب ہم اس کو سنا چکیں تو اس سنانے کی پیروی کرو پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی حفاظت کرنا۔''

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ. (الحجر ۱۵: ۹)

''یہ یاد دہانی ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔''

جب قرآن کی حفاظت کا معاملہ یہ ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر قرآن کی چھ قراء تیں کیسے ضائع ہو گئیں۔

۳۔ قرآنِ مجید میں کسی بھی قسم کے تغیر کے بارے میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ. (یونس ۱۰: ۱۵)

''کہہ دو مجھے کیا حق ہے کہ میں اس (قرآن) میں اپنے جی سے ترمیم کر دوں میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو بے شک میں ایک ہول ناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔''

قرآن میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کے بارے میں اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار کا یہ عالم ہے تو پھر ان کے سوا اور کون ہے جس نے قرآن کی چھ قراء توں کو منسوخ قرار دینے کی جسارت کی اور اسے نسخ کا یہ اختیار کہاں سے ملا؟

۴۔ زیرِ بحث روایت میں مذکور واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہشام بن حکیم کے ایک نماز کی امامت کرتے ہوئے سورۂ فرقان کی تلاوت سے قراءتِ عامہ کے علاوہ دوسری قراءتوں کا انکشاف ہوا۔ ہشام فتح مکہ کے بعد ایمان لائے، فتح مکہ کے بعد ہجرت کرنا واجب نہ رہا تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت چند مہینے ہی میسر آئی ہو گی جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عمر کی رفاقت کا عرصہ کم و بیش بیس برسوں پر محیط ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سفر و حضر کے جان نثاروں کو چھوڑ کر کسی خلوت گاہ میں ہشام جیسے نو مسلم کو قرآن کی نادر قراءتیں سکھائیں؟

۵۔ حدیث کے الفاظ ''سبعہ احرف'' کا مطلب کیا ہے؟ ''احرف'' حرف کی جمع ہے، عربی میں یہ لفظ کنارے، دھار اور نوکیلے سرے کے معنوں میں آتا ہے۔ اس کی واحد معقول توجیہ (معروف سے ہٹ کر) یہ ہو سکتی تھی کہ اسے مختلف عرب قبائل کی لغات اور لہجوں پر محمول کیا جائے (یہ اگرچہ اس لفظ کا نادر استعمال ہے) لیکن روایت کا متن، ان معنوں کو بھی قبول نہیں کرتا۔ حضرت ہشام اور حضرت عمر دونوں قریشی ہیں لہٰذا ان کے لہجوں میں اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

امام سیوطی نے اپنی کتاب ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں ''سبعہ احرف'' کے معنی کی تعیین میں چالیس کے قریب اقوال نقل کیے ہیں اور ہر ایک پر تنقید کر کے ان کی کمزوری واضح کر دی ہے۔ اس کے بعد اپنی موطا امام مالک کی شرح تنویر الحوالک میں بالآخر انھوں نے اعتراف کر لیا ہے کہ ''سبعہ احرف'' کے معنی متشابہات میں سے ہیں اس کی مراد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، وہ لکھتے ہیں:

وارجها عندی قول من قال ان هذا من المتشابه الذی لا يدری تاويله. (باب: ماجا فی القرآن ج۱، ص۱۵۹)	''میرے نزدیک سب سے بہتر رائے اس معاملے میں انھی لوگوں کی ہے جو کہتے ہیں کہ یہ روایت ان امورِ متشابہات میں سے ہے جن کی حقیقت کسی طرح نہیں سمجھی جا سکتی۔''

۶۔ عربوں میں لہجوں اور لغات کے اختلاف کے باعث یہ تو ہو سکتا تھا کہ مختلف قبیلوں کو اپنے اپنے لہجوں میں قرآن پڑھنے کی اجازت دے دی جاتی لیکن یہ کہنا کہ قرآن نازل ہی سات قراءتوں میں ہوا تھا، قرآن ہی کی صریح نص کے خلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن قریش کی ٹکسالی زبان (Sandard Language) میں

نازل ہوا تھا:

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ.(الدخان ۴۴:۵۸)

"پس ہم نے اس قرآن کو تمھاری زبان میں نہایت خوبی سے آراستہ کیا تاکہ وہ (مشرکین بنی اسماعیل) یاددہانی حاصل کریں۔"

'تیسیر' عربی زبان میں کسی چیز کو کسی مقصد کے لیے موزوں اور سازگار بنانے اور محکم و استوار کرنے کو کہتے ہیں۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے اور تعلیم و تذکیر کے لیے یہ تمام ضروری لوازم سے آراستہ ہے، قراءت سبعہ کو مان لینے سے ایک تو 'تیسیر' ختم ہو جاتی ہے اور دوسرے ان قراءتوں کے لیے 'انزل' کا فعل کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے۔

۷۔ روایت کے آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تبصرے کی صورت میں 'فاقروا ما تیسر منه' (اس میں سے جتنا میسر ہو سکے پڑھ لیا کرو) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔ یہ جملہ بعینہٖ سورۂ مزمل میں نقل ہوا ہے جہاں اس سے مراد قرآنِ مجید ہے لیکن روایت میں چونکہ قراءتوں کا معاملہ زیرِ بحث ہے اس لیے اس جملے کا مصداق لازماً "سبعہ احرف" کو ہونا چاہیے مگر منه کی ضمیر غائب مذکر ہے اور اس کا مرجع "سبعہ احرف" کو قرار دینا ممکن نہیں (اس کے لیے 'منه' کے بجائے 'منها' ہوتا تو گوارا تھا)۔ سوال یہ ہے کہ 'منه' کی ضمیر مذکر (غائب) کا مرجع کیا ہے اگر 'سبعہ احرف' کی طرف راجح ضمیر لانا مقصود تھا تو 'با' کے صلے کے ساتھ زیادہ موزوں ہوتا یعنی قواعدِ عربیت کی رو سے 'منه' کے بجائے 'بها' ہونا چاہیے تھا۔ اس مشکل کا حل کیا ہے؟

یہ سوالات ایسے نہیں ہیں جنھیں نظر انداز کر دیا جائے۔ اہلِ علم سے درخواست ہے کہ وہ ان سوالات پر غور کریں اور دنیاے علم کو اپنے جواب سے آگاہ کریں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی/منظور الحسن

[مدیرِ ''اشراق'' کے افادات سے مرتب کیا گیا]

عالمِ برزخ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.com

دنیا کی ہر زبان کا یہ مسلمہ اسلوب ہے کہ جن امور سے ہم براہِ راست واقف نہ ہوں، ان کے بارے میں بیان کرنے کے لیے کوئی علامت یا تعبیر اختیار کر لی جاتی ہے۔ عالمِ برزخ بھی اسی طرح کی تعبیر ہے۔ اس سے مراد انسانوں کے دنیا سے رخصت ہونے کے وقت سے لے کر قیامت تک کا زمانہ ہے۔ انسان جب اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو کر قیامت تک کے لیے ایک اوٹ میں چلا جاتا ہے۔ عربی زبان میں اوٹ کے لیے ''برزخ'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اسی سے ہمارے ہاں موت کے بعد اور قیامت سے پہلے کے احوال کے لیے برزخ کی اصطلاح رائج ہوئی ہے۔ قرآنِ مجید میں یہ لفظ سورۂ مومنون میں آیا ہے۔ ارشاد ہے:

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ. لَعَلِّیْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ.(۲۳:۹۹-۱۰۰)

''یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت سر پر آن کھڑی ہو گی تو وہ کہے گا کہ اے رب، مجھے پھر واپس بھیج کہ جو کچھ چھوڑ آیا ہوں اس میں کچھ نیکی کماؤں! ہر گز نہیں، یہ محض ایک بات ہے جو وہ کہنے والا بنے گا اور آگے ان کے ایک پردہ ہو گا اس دن تک کے لیے جس دن وہ اٹھائے جائیں گے۔''

برزخ، کیفیتِ زندگی ہے یا حالتِ موت؟ یہ اسی دنیا کا کوئی حصہ ہے یا اس سے ماورا کوئی عالم؟ اس عالم میں انسان کسی احساس کے بغیر ہو گا یا رنج و راحت کو محسوس کرے گا؟ اس اوٹ میں انسان بے خبر ہو گا یا اسے کچھ احوال پیش آئیں گے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو اس معاملے میں ہمارے ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان پر غور کرنے کے لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم پہلے موت و حیات، حساب کتاب اور جزا و سزا کے حوالے سے قرآنِ مجید کے نصوص کا مطالعہ کریں:

۱۔ موت دنیوی زندگی سے پہلے

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ.(البقرۃ۲:۲۸)

''تم اللہ کا کس طرح انکار کرتے ہو اور حال یہ ہے کہ تم مردہ تھے تو اس نے تم کو زندہ کیا۔''

۲۔ دنیوی زندگی

فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۭ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ.(الحج۲۲:۵)

''ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر ایک قطرۂ آب سے، پھر ایک جنین سے، پھر ایک لوتھڑے سے، کوئی کامل ہوتا ہے اور کوئی ناقص۔ ایسا ہم نے اس لیے کیا تاکہ تم پر اپنی قدرت و حکمت اچھی طرح واضح کر دیں اور ہم رحموں میں ٹھہرا دیتے ہیں جو چاہتے ہیں ایک مدتِ معین کے لیے۔ پھر ہم تم کو ایک بچے کی شکل میں برآمد کرتے ہیں، پھر ایک وقت دیتے ہیں کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔''

۳۔ موت دنیوی زندگی کے بعد

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۣ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ.(العنکبوت۲۹:۵۷)

''ہر جان کو موت کا مزا چکھنا ہے پھر تم ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ.
(السجدہ۳۲:۱۱)

''کہہ دو تمھاری جان وہ فرشتہ ہی قبض کرتا ہے جو تم پر مامور ہے پھر تم اپنے رب ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

۴۔ شہادت کے بعد کی زندگی

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ. (البقرہ۲: ۱۵۴)

”اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں، تم اس کا شعور نہیں رکھتے۔“

۵۔ قیامت اور دوسری زندگی کا آغاز

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ. عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ.

(الواقعہ ۵۶: ۶۰-۶۱)

”ہم نے تمھارے درمیان موت مقدر کی ہے اور ہم عاجز رہنے والے نہیں ہیں، بلکہ قادر ہیں اس بات پر کہ ہم تمھاری جگہ تمھارے مانند بنا دیں اور تم کو اٹھائیں اس عالم میں جس کو تم نہیں جانتے۔“

وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ. وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ. حِكْمَةٌ ۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ. فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ۘ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ. خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ. مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ؕ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ. (القمر ۵۴: ۳-۸)

”اور ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ اور ان کو ماضی کی سرگزشتیں پہنچ چکی ہیں جن میں کافی سامانِ عبرت موجود ہے، نہایت دل نشیں حکمت۔ لیکن تنبیہات کیا کام دے رہی ہیں! تو ان سے اعراض کرو اور اس دن کا انتظار کرو جس دن پکارنے والا ان کو ایک نہایت ہی نامطلوب چیز کی طرف پکارے گا۔ ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی اور یہ نکلیں گے قبروں سے جس طرح منتشر ٹڈیاں نکلتی ہیں، بھاگتے ہوئے پکارنے والے کی طرف۔ اس وقت کافر کہیں گے، یہ تو بڑا کٹھن دن آگیا۔“

۶۔ دو زندگیاں اور دو موتیں

قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى

”وہ کہیں گے، اے ہمارے رب! تو نے ہم کو دو بار موت دی اور دو بار زندگی دی تو ہم نے اپنے

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ. (المومن ۴۰: ۱۱)

گناہوں کا اقرار کر لیا تو کیا یہاں (دوزخ) سے نکلنے کی بھی کوئی سبیل ہے!"

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ. (البقرۃ ۲: ۲۸)

"تم اللہ کا کس طرح انکار کرتے ہو اور حال یہ ہے کہ تم مردہ تھے تو اس نے تم کو زندہ کیا، پھر وہ تم کو موت دیتا ہے پھر زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔"

۷۔ دنیا میں عذاب

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ. (العنکبوت ۲۹: ۴۰)

"پس ہم نے ان میں سے ہر ایک کو اس کے گناہ کی پاداش میں پکڑا۔ ان میں سے بعض پر ہم نے گرد باد کا طوفان بھیجا۔ اور ان میں سے بعض کو کڑک نے آ پکڑا اور ان میں سے بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے بعض کو ہم نے غرق کر دیا اور اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔"

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۸۔ بعد از موت اور قبل از قیامت انعام اور عذاب

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ. (الانفال ۸: ۵۰)

"اور اگر تم دیکھ پاتے جب فرشتے ان کفر کرنے والوں کی روحیں قبض کرتے ہیں مارتے ہوئے ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر، اور یہ کہتے ہوئے کہ اب چکھو مزا جلنے کے عذاب کا۔"

وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ. اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۗ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ. (المومن ۴۰: ۴۵-۴۶)

"اور فرعون والوں کو برے عذاب نے گھیر لیا۔ آگ ہے جس پر صبح و شام وہ پیش کیے جاتے ہیں، اور جس دن قیامت ہو گی حکم ہو گا کہ فرعون والوں کو بدترین عذاب میں داخل کرو۔"

قِيۡلَ ادۡخُلِ الۡجَنَّةَ ؕ قَالَ يٰلَيۡتَ قَوۡمِیۡ يَعۡلَمُوۡنَ. بِمَا غَفَرَ لِیۡ رَبِّیۡ وَجَعَلَنِیۡ مِنَ الۡمُكۡرَمِيۡنَ.(یٰسین ۳۶: ۲۶-۲۷)

’’(آلِ فرعون کا مردِ مومن اپنی قوم کو پیغمبر پر ایمان لانے کی نصیحت کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوا تو ارشاد ہوا کہ) جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اس نے کہا: کاش! میری قوم جانتی کہ میرے رب نے مجھے بخش دیا اور مجھے عزت پانے والوں میں سے بنایا۔‘‘

وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡيَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُوۡنَ.(آلِ عمران ۳: ۱۶۹)

’’اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں ان کو مردہ نہ خیال کرو، بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، انھیں روزی مل رہی ہے۔‘‘

۹۔ آخرت کے عذاب سے پہلے دو مرتبہ عذاب

وَمِمَّنۡ حَوۡلَكُمۡ مِّنَ الۡاَعۡرَابِ مُنٰفِقُوۡنَ ؕۛ وَمِنۡ اَهۡلِ الۡمَدِيۡنَةِ ؔۛ مَرَدُوۡا عَلَى النِّفَاقِ ۟ لَا تَعۡلَمُهُمۡ ؕ نَحۡنُ نَعۡلَمُهُمۡ ؕ سَنُعَذِّبُهُمۡ مَّرَّتَيۡنِ ثُمَّ يُرَدُّوۡنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيۡمٍ.(التوبہ ۹: ۱۰۱)

’’اور تمھارے ارد گرد جو دیہاتی ہیں ان میں منافق ہیں اور مدینہ والوں میں بھی منافق ہیں۔ یہ اپنے نفاق میں منجھ گئے ہیں۔ تم ان کو نہیں جانتے، ہم ان کو جانتے ہیں۔ ہم انھیں دو بار عذاب دیں گے۔ پھر وہ ایک عذابِ عظیم کی طرف دھکیلے جائیں گے۔‘‘

۱۰۔ آخرت میں دوزخ کا عذاب

اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَوۡ اَنَّ لَهُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا وَّمِثۡلَهٗ مَعَهٗ لِيَفۡتَدُوۡا بِهٖ مِنۡ عَذَابِ يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنۡهُمۡ ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ. يُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يَّخۡرُجُوۡا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمۡ بِخٰرِجِيۡنَ مِنۡهَا ۟ وَلَهُمۡ عَذَابٌ مُّقِيۡمٌ.

’’بے شک جن لوگوں نے کفر کیا ہے اگر انھیں وہ سب کچھ حاصل ہو جائے جو زمین میں ہے اور اس کے ساتھ اس کے برابر اور بھی تا کہ وہ اس کو فدیہ میں دے کر روزِ قیامت کے عذاب سے چھوٹ سکیں تو بھی ان کا فدیہ قبول نہ ہو گا، ان کے لیے بس ایک دردناک عذاب

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

(المائدہ۵: ۳۶-۳۷)

ہی ہے۔ وہ زور لگائیں گے کہ آگ سے نکل بھاگیں لیکن اس سے کبھی نکل نہ پائیں گے، ان کے لیے ایک دائمی عذاب ہوگا۔"

۱۱۔ دنیوی زندگی ہی میں بغیرِ حساب اخروی انجام کا فیصلہ

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ.

(التوبہ۹: ۱۰۰)

"اور مہاجرین و انصار میں سے جو سب سے پہلے سبقت کرنے والے ہیں، اور پھر جن لوگوں نے خوبی کے ساتھ ان کی پیروی کی ہے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ ان سے راضی ہوئے۔ اور اس نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں یہ ہمیشہ رہیں گے اور بڑی کامیابی یہی ہے۔"

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ. مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ. (آلِ عمران۳: ۱۹۶-۱۹۷)

"اور ملک کے اندر اِن کافروں کی یہ سرگرمیاں تمھیں کسی مغالطہ میں نہ ڈالیں یہ چند دن کی چاندنی ہے پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیا ہی بری جگہ ہے۔"

۱۲۔ بعد از قیامت حساب کے بعد اخروی انجام کا فیصلہ

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ. وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ. فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ. فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ. وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ. فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ.

(القارعہ۱۰۱: ۴-۹)

"اس دن لوگ بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح ہوں گے اور پہاڑ دھنی ہوئی اون کی طرح ہو جائیں گے۔ پھر جس کے پلڑے بھاری ہوئے، وہ دل پسند عیش میں ہوگا اور جس کے پلڑے ہلکے ہوئے اس کا ٹھکانا گہری کھائی ہے۔"

مندرجہ بالا آیات کا خلاصہ ہم ان نکات کی صورت میں کر سکتے ہیں:

۱۔ اس دنیا میں آنے سے پہلے انسان مردہ تھا۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

۲۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پہلی موت کے بعد پہلی زندگی عطا فرمائی اور بچے کی صورت میں اسے دنیا میں بھیجا۔

۳۔ پہلی زندگی کے بعد اللہ تعالیٰ کے اذن سے فرشتہ انسان کی جان قبض کر لیتا ہے۔ انسان پر دوسری مرتبہ موت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور انسان دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

۴۔ دنیا سے رخصت ہونے کے بعد قیامت سے پہلے ہی بعض لوگوں کو دوسری زندگی میسر ہو جاتی ہے۔

۵۔ ایک وقتِ مقررہ پر قیامت واقع ہو گی اور تمام انسان بیک وقت دوسری زندگی حاصل کر لیں گے۔

۶۔ دوسری زندگی اپنی حقیقت کے اعتبار سے بالکل پہلی زندگی جیسی ہی ہو گی۔

۷۔ ہر انسان کو اپنی پوری تاریخ میں دو زندگیاں اور دو موتیں حاصل ہوں گی۔

۸۔ بعض انسانوں کو دنیوی زندگی ہی میں عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

۹۔ بعض انسانوں کو موت کے بعد اور قیامت سے پہلے انعام اور عذاب ملے گا۔

۱۰۔ بعض لوگوں کو آخرت کے عذابِ عظیم سے پہلے دو مرتبہ عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

۱۱۔ بعض انسانوں کے لیے قیامت کے بعد دوزخ کا اخروی عذاب شروع ہو گا۔

۱۲۔ بعض لوگوں کے اخروی انجام کا فیصلہ ان کی دنیوی زندگی ہی میں سنا دیا گیا ہے۔

۱۳۔ قیامت کے بعد دوسری زندگی ملتے ہی اعمال کا باقاعدہ حساب شروع ہو جائے گا۔

۱۴۔ باقاعدہ حساب کتاب کے بعد انسانوں کی جزا و سزا طے ہو گی اور انھیں جنت و دوزخ میں داخل کیا جائے گا۔

قرآنِ مجید کے درج بالا مقامات کا اگر ہم بادی النظر میں مطالعہ کریں تو بظاہر چند تضادات محسوس ہوتے ہیں:

پہلا تضاد یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک طرف قرآنِ مجید یہ واضح کرتا ہے کہ ہر انسان کو دو زندگیاں میسر آئیں گی، ایک دنیوی زندگی اور ایک اخروی زندگی (۴۰: ۱۱) اور دوسری طرف بعض انسانوں کے حوالے سے موت اور قیامت کے درمیان میں ایک تیسری زندگی کا تصور بھی پیش کرتا ہے (۲: ۱۵۴)۔

دوسرا تضاد یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک طرف قرآنِ مجید یہ بیان کرتا ہے کہ ایک مقرر وقت پر قیامت برپا ہونے کے بعد جزا و سزا کا معاملہ شروع ہو گا (۱۰۱: ۴-۹) اور دوسری طرف اس کی آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موت کے فوراً بعد اور قیامت سے پہلے ہی جزا و سزا کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ (۸: ۵۰، ۴۰: ۴۵-۴۶، ۳:

۱۶۹)۔ پھر جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ مجید نے آخرت کے عذاب سے پہلے دو مرتبہ عذاب دینے کا حکم سنایا ہے (۹:۱۰۱) تو یہ تضاد اور زیادہ نمایاں محسوس ہونے لگتا ہے۔

تیسرا تضاد یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک طرف قرآنِ مجید کا مقدمہ یہ ہے کہ قیامت کے موقع پر باقاعدہ حساب کتاب کے بعد جنت اور دوزخ کا فیصلہ ہو گا (۱۰۱: ۴-۹) اور دوسری طرف اسی کی آیات سے یہ تاثر ملتا ہے کہ موت کے ساتھ ہی جنت اور دوزخ میں داخلہ شروع ہو جائے گا (۱۶: ۲۸-۲۹، ۳۶: ۲۶-۲۷)۔ اس کے علاوہ اس بارے میں بھی واضح اشارات ملتے ہیں کہ انسانوں کی زندگی ہی میں جنت اور دوزخ کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ (۹:۱۰۰، ۳:۱۹۶-۱۹۷)

ان تضادات کو محسوس کرنے کے بعد تین رویے اختیار کیے جا سکتے ہیں:

ایک یہ کہ قرآنِ مجید کو ایک ایسی کتاب قرار دے دیا جائے جس کی آیات (نعوذ باللہ) باہم متضاد اور متناقض ہیں۔

دوسرے یہ کہ آدمی اپنی کوتاہیِ فہم کا اعتراف کر کے خاموش ہو جائے۔

تیسرے یہ کہ غور و فکر کر کے قرآنِ مجید کے ان مقامات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

بالبداہت واضح ہے کہ اس معاملے میں تیسرا رویہ ہی صحیح رویہ ہے۔ قرآنِ مجید پروردگارِ عالم کا کلام ہے، اس میں تناقض کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ان آیات کی روشنی میں ہم اپنا نقطۂ نظر ان عنوانات کے تحت بیان کریں گے:

۱۔ موت اور قیامت میں حائل پردہ

۲۔ جسمانی وجود کے ساتھ دو زندگیاں

۳۔ وفات و حیات کا مختلف مفہوم اور برزخ کی کیفیت

۴۔ عالمِ برزخ میں مختلف انسانوں سے مختلف معاملہ

۵۔ عذابِ آخرت سے پہلے دنیوی اور برزخی عذاب

۶۔ حساب کتاب کے حوالے سے انسانوں کے تین گروہ

۱۔ موت اور قیامت میں حائل پردہ

قرآنِ مجید نے موت اور قیامت کے درمیان کی کیفیت کو 'برزخ' سے تعبیر کیا ہے۔ جس کا معنی پردہ یا

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اوٹ ہے۔ ارشاد ہے:

حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ. لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَکْتُ کَلَّا ط اِنَّھَا کَلِمَۃٌ ھُوَ قَآئِلُھَا ط وَمِنْ وَّرَآئِھِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ. (۲۳:۹۹-۱۰۰)

''یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت سر پر آن کھڑی ہو گی تو وہ کہے گا کہ اے رب، مجھے پھر واپس بھیج کہ جو کچھ چھوڑ آیا ہوں اس میں کچھ نیکی کماؤں! ہر گز نہیں، یہ محض ایک بات ہے جو وہ کہنے والا بنے گا اور آگے ان کے ایک پردہ ہو گا اس دن تک کے لیے جس دن وہ اٹھائے جائیں گے۔''

۲۔ جسمانی وجود کے ساتھ دو زندگیاں

قرآنِ مجید نے اس بات کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ انسان کو دو زندگیاں ودیعت ہوں گی۔ ایک زندگی اس دنیا میں موت سے پہلے اور دوسری زندگی قیامت کے بعد۔ یعنی ایک دنیوی زندگی اور ایک اخروی زندگی۔ یہ دونوں زندگیاں اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک جیسی ہوں گی۔ قیامت کی زندگی ہو بہو ویسی ہی ہو گی جیسی انسان نے دنیا میں گزاری۔ وہ اسی طرح جسمانی اعضا کا حامل ہو گا، اسی طرح اس کی رگوں میں خون گردش کرے گا۔ اسی طرح اس کا سلسلۂ تنفس جاری ہو گا، اسی طرح وہ سماعت، بصارت اور نطق کی صلاحیتوں کا حامل ہو گا۔ گویا ایسی ہی زندگی اپنی کامل شکل میں وہاں ظہور پزیر ہو گی۔ قرآنِ مجید نے اپنے لافانی اسلوب میں ''دو بار زندگی'' کے الفاظ استعمال کر کے اس حقیقت کو پوری طرح واضح کر دیا ہے۔ سورۂ مومن میں ارشاد ہے:

قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَیْنِ وَاَحْیَیْتَنَا اثْنَتَیْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَھَلْ اِلٰی خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِیْلٍ. (۴۰:۱۱)

''وہ کہیں گے، اے ہمارے رب! تو نے ہم کو دو بار موت دی اور دو بار زندگی دی تو ہم نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا تو کیا یہاں (دوزخ) سے نکلنے کی بھی کوئی سبیل ہے!''

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''اس وقت یہ لوگ بڑی سعادت مندی اور بڑی صفائی کے ساتھ کہیں گے کہ اے رب اب ہم اپنے تمام

جرائم کا اقرار کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا ناممکن تھا اس وجہ سے ہم تیرے مواخذہ و محاسبہ سے بے خوف ہو کر تیرے رسول اور اس کی دعوت کا مذاق اڑاتے رہے لیکن اب تو نے ہمیں دو بار موت اور دو بار زندگی دے کر موت کے بعد کی زندگی کا اچھی طرح مشاہدہ کرا دیا، تو کیا اب اس کی بھی کوئی سبیل ہے کہ اس دوزخ سے ہمیں نکلنا نصیب ہو کہ ہم از سرِ نو دنیا میں جا کر ایمان اور عملِ صالح کی زندگی بسر کریں۔

دو بار موت سے ایک تو وہ حالتِ موت مراد ہے جو اس دنیا میں وجود پزیر ہونے سے پہلے انسان پر طاری ہوتی ہے اور دوسری وہ موت ہے جس سے ہر زندہ کو لازماً دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح زندگی ایک تو وہ ہے جو اس دنیا میں حاصل ہوتی ہے اور دوسری وہ جو قیامت کو حاصل ہو گی۔" (تدبرِ قرآن ج ۷، ص ۲۳)

اس سے واضح ہوا کہ انسان کو اپنی پوری تاریخ میں دو زندگیاں ہی حاصل ہوں گی۔ اس کے علاوہ اس نوعیت کی کوئی تیسری زندگی اسے حاصل نہیں ہو گی۔ چنانچہ عالمِ برزخ میں انسانی زندگی کی کیفیت دنیوی اور اخروی زندگی سے مختلف ہو گی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۳۔ وفات و حیات کا مختلف مفہوم اور برزخ کی کیفیت

قرآنِ مجید نے وفات اور حیات کے الفاظ کو ان کے عام مفہوم سے کچھ مختلف معنی میں بھی استعمال کیا ہے۔

'وفات' کا عام مفہوم انسان کا دنیا سے رخصت ہو جانا ہے، لیکن قرآنِ مجید نے نیند کے لیے بھی 'وفات' کی تعبیر اختیار کی ہے: ارشاد فرمایا ہے:

وَهُوَ الَّذِىْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ. (الانعام ۶: ۶۰)

"اور وہی ہے جو تمھیں رات میں وفات دیتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم نے دن میں کیا ہے، پھر تمھیں اس میں اٹھاتا ہے تاکہ مدتِ معین پوری کی جائے، پھر اسی طرف تمھارا لوٹنا ہے"

'حیات' کا عام مفہوم دنیا میں زندگی بسر کرنا ہے، لیکن قرآنِ مجید نے یہی لفظ اللہ کی راہ میں قتل ہو کر دنیا سے رخصت ہو جانے والوں کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا

"اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں تم اس کا شعور نہیں

تَشْعُرُوْنَ. (البقرہ ۲: ۱۵۴) رکھتے۔‘‘

گویا انسان زندگی رکھتے ہوئے بھی نیند کی حالت میں موت کی آغوش میں ہوتا ہے اور موت کی آغوش میں جا کر بھی زندگی سے بہرہ مند رہ سکتا ہے، لیکن نہ نیند عام معنوں میں موت ہے اور نہ شہدا کی زندگی عام معنوں میں زندگی ہے۔ نیند کی موت چونکہ ہمارے روزمرہ معمول کا حصہ ہے اس لیے اس کا ہم کافی حد تک شعور رکھتے ہیں۔ شہادت کے بعد کی زندگی کا ہم کوئی تجربہ نہیں رکھتے، اس لیے ہمیں اس کا کچھ شعور بھی نہیں ہے۔

شہدا کی یہ زندگی ظاہر ہے کہ وہ زندگی نہیں ہے جو قیامت کے بعد انسانوں کو حاصل ہو گی۔ اگر اس سے مراد وہی زندگی ہوتی تو پھر اللہ تعالیٰ یہ ارشاد نہ فرماتے کہ تم اس کا شعور نہیں کر سکتے۔ قیامت کی زندگی چونکہ دنیوی زندگی جیسی ہے اس لیے اس کا شعور ہمارے لیے نہایت آسان ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ قیامت سب انسانوں کے لیے ایک ہی وقت پر آئے گی، اس بنا پر شہدا کی موت کو قیامت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ واضح ہے کہ شہدا کو موت کے بعد حاصل ہونے والی زندگی درحقیقت موت اور قیامت کے مابین کی زندگی ہے جسے برزخ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ان اشارات کی بنا پر ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ عالمِ برزخ حالتِ نوم سے مماثل ایک کیفیت ہے، جس میں ہم پر ایک نوعیت کی موت طاری ہوتی ہے اور ایک نوعیت کی زندگی ہم بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ موت ایسی ہوتی ہے کہ ہم اپنے جسمانی وجود اور اس کے بعض لوازم سے محروم ہوتے ہیں اور زندگی اس زندگی کے مماثل ہوتی ہے جیسی ہم کیفیتِ نیند میں بسر کرتے ہیں۔

اس عالم میں جزا و سزا کے احوال کو عالمِ خواب پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ نیند کی حالت میں ہر انسان خواب دیکھتا ہے۔ خواب اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔ اچھا خواب انسان پر فرحت و تسکین کی کیفیت طاری کرتا ہے جبکہ برا خواب انسان کی طبیعت میں اضطراب و بے چینی پیدا کرتا ہے۔ اس کیفیت میں انسان کا جسم تو ساکت ہوتا ہے مگر وہ رنج و راحت کو محسوس کر رہا ہوتا ہے۔ اس بنا پر یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ عالمِ برزخ میں جزا و سزا کا معاملہ اسی طرح ہو گا۔

تاہم برزخ کے لیے حالتِ نوم اور عالمِ خواب کی تعبیرات مماثلت کو بیان کرنے اور تفہیمِ مدعا کے لیے تو اختیار کی جا سکتی ہیں مگر قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عالمِ برزخ اور عالمِ خواب ایک ہی جیسے عالم ہیں۔ عالمِ برزخ میں کیفیتِ زندگی کا معاملہ بہرحال امورِ متشابہات میں سے ہے۔ اس بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا

جا سکتا۔

۴۔ عالمِ برزخ میں مختلف انسانوں سے مختلف معاملہ

قرآنِ مجید پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمِ برزخ میں جزاوسزا کے حوالے سے انسانوں کے مختلف طبقوں سے مختلف معاملہ ہو گا۔ ان میں سے دو طبقات کے بارے میں قرآن بہت واضح ہے۔ ایک شہدا کا طبقہ اور دوسرے رسولوں کے اتمامِ حجت کے بعد صفحۂ ہستی سے مٹا دیے جانے والے کفار کا طبقہ۔

پہلے طبقے کے بارے میں قرآنِ مجید کا واضح ارشاد ہے:

وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ قُتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡيَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُوۡنَ. (آلِ عمران ۳:۱۶۹)

’’اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں ان کو مردہ نہ خیال کرو بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، انھیں روزی مل رہی ہے۔‘‘

یعنی وہ لوگ جنھوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا، وہ دنیا سے رخصت ہو کر اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور اس کی طرف سے رزق پا کر خوش و خرم ہوں گے۔

دوسرے طبقے کے بارے میں بھی بہت وضاحت سے بیان ہوا ہے:

وَلَوۡ تَرٰۤى اِذۡ يَتَوَفَّى الَّذِيۡنَ كَفَرُوا الۡمَلٰۤـئِكَةُ يَضۡرِبُوۡنَ وُجُوۡهَهُمۡ وَاَدۡبَارَهُمۡ‌ۚ وَذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِيۡقِ. (الانفال ۸:۵۰)

’’اور اگر تم دیکھ پاتے جب فرشتے ان کفر کرنے والوں کی روحیں قبض کرتے ہیں مارتے ہوئے ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر، اور یہ کہتے ہوئے کہ اب چکھو مزا جلنے کے عذاب کا۔‘‘

وَحَاقَ بِاٰلِ فِرۡعَوۡنَ سُوۡٓءُ الۡعَذَابِ. اَلنَّارُ يُعۡرَضُوۡنَ عَلَيۡهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا‌ ۚ وَيَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَةُ ۚ اَدۡخِلُوۡۤا اٰلَ فِرۡعَوۡنَ اَشَدَّ الۡعَذَابِ. (المومن ۴۰:۴۵-۴۶)

’’اور فرعون والوں کو برے عذاب نے گھیر لیا۔ آگ ہے جس پر صبح و شام وہ پیش کیے جاتے ہیں، اور جس دن قیامت ہو گی حکم ہو گا کہ فرعون والوں کو اس سے زیادہ سخت عذاب میں داخل کرو۔‘‘

یعنی وہ لوگ جنھیں اللہ کے رسولوں نے براہِ راست اللہ کی بندگی کی دعوت دی مگر انھوں نے اسے قبول کرنے کے بجائے جانتے بوجھتے اس کا انکار کیا اور تمام عمر پیغمبر کی مخالفت پر کمربستہ رہے۔ رسولوں کی طرف سے

اتمامِ حجت کے بعد ان پر اللہ کا عذاب نازل ہوا اور وہ نیست و نابود ہو گئے۔ وہ لوگ دنیا سے ختم ہونے کے بعد قیامت سے پہلے ہی عذاب کی کیفیت میں مبتلا ہوں گے۔

ان کے علاوہ جتنے لوگ ہیں، یعنی جو نہ تو رسولوں کی تکذیب کے جرم میں صفحۂ ہستی سے مٹائے گئے اور نہ شہادت کے منصب پر فائز ہوئے، ان کے بارے میں قرآنِ مجید خاموش ہے۔

۵۔ عذابِ آخرت سے پہلے دنیوی اور برزخی عذاب

قرآنِ مجید کا وہ مقام جس میں نہایت صراحت کے ساتھ برزخ کی زندگی کی طرف اشارہ موجود ہے وہ سورۂ توبہ کی آیت ۱۰۱ ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ؕ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ؔ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۟ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ.

”اور تمھارے ارد گرد جو دیہاتی ہیں ان میں منافق ہیں اور مدینہ والوں میں بھی منافق ہیں۔ یہ اپنے نفاق میں منجھ گئے ہیں۔ تم ان کو نہیں جانتے، ہم ان کو جانتے ہیں۔ ہم انھیں دو بار عذاب دیں گے۔ پھر وہ ایک عذابِ عظیم کی طرف دھکیلے جائیں گے۔“

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

یہ آیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ان مخاطبین کے بارے میں ایک وعید کے طور پر آئی ہے جنھوں نے پیغمبر اور اس کی دعوت کا اقرار محض اپنے اغراض و مفادات کی خاطر کیا۔ درحقیقت یہ پیغمبر کی مخالفت پر کمربستہ تھے اور درپردہ مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔ ان لوگوں کے لیے آخرت کے عذابِ عظیم سے پہلے دو مرتبہ عذاب کا اعلان کیا گیا۔ ایک وہ عذابِ دنیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسولوں کے ان مخاطبین پر نازل ہوتا رہا ہے جو اتمامِ حجت کے بعد کفر اور سرکشی پر جمے رہے۔ اس عذاب کی تاریخ عاد، ثمود، قومِ لوط اور آلِ فرعون کے حوالے سے قرآنِ مجید میں درج ہے:

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا

”پس ہم نے ان میں سے ہر ایک کو اس کے گناہ کی پاداش میں پکڑا۔ ان میں سے بعض پر ہم نے گرد باد کا طوفان بھیجا۔ اور ان میں سے بعض کو کڑک نے آ پکڑا اور ان میں سے بعض کو ہم نے

كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ.(العنکبوت ۲۹: ۴۰)

زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے بعض کو ہم نے غرق کر دیا اور اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب عرب کے مشرکین و منافقین پر یہ عذاب اہلِ ایمان کی تلواروں کے ذریعے سے نازل ہوا:

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ. فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ.(التوبہ ۹: ۱، ۵)

"ان مشرکین سے اللہ اور رسول کی طرف سے اعلانِ برأت ہے جن سے تو نے معاہدے کیے تھے... سو جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو ان مشرکین کو جہاں کہیں پاؤ قتل کرو۔"

دوسرا وہ عذابِ برزخ ہے جو ان پر دنیا سے رخصت ہونے کے بعد اور قیامت کے واقع ہونے سے پہلے نازل ہو گا۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

"'سنعذبھم مرتین' (ہم انھیں دو مرتبہ عذاب دیں گے) میں ایک تو اس سزا کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں کے ہاتھوں ان کو ملنے والی ہے۔ دوسرے اس عذاب کی طرف جس سے یہ عالمِ برزخ میں دوچار ہوں گے۔ 'ثم یردون الی عذاب عظیم' یہ عذابِ آخرت کی طرف اشارہ ہے جو سب سے زیادہ سخت ہو گا۔" (تدبرِ قرآن، ج ۳، ص ۶۳۷)

۶۔ حساب کتاب کے حوالے سے انسانوں کے تین گروہ

قرآنِ مجید کے واضح اشارات سے ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ آخرت میں حساب کتاب کے حوالے سے انسانوں کے تین گروہ ہوں گے۔

پہلا گروہ انبیا، شہدا، صدیقین اور صالحین پر مشتمل ہو گا۔ یعنی وہ لوگ جنھوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ صرف اور صرف اپنے پروردگار کی خوش نودی کے لیے گزارا۔ ان لوگوں کا پرجوش خیر مقدم کیا جائے گا۔ ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ، محمد علیہم السلام اور ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اسی گروہ میں شامل ہوں گے:

وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا. وَمَنْ

"اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں

يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا. ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا.(النساء۴:۶۸-۷۰)

گے وہی ہیں جو انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین کے اس گروہ کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے اپنا فضل فرمایا اور کیا ہی اچھے ہیں یہ رفیق! یہ اللہ کی طرف سے فضل ہے اور اللہ کا علم کفایت کرتا ہے۔"

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ.(الحدید۵۷:۱۹)

"اور جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولوں پر وہی لوگ اپنے رب کے ہاں صدیقوں اور شہدا کے زمرے میں ہوں گے۔ ان کے لیے ان کا صلہ بھی ہو گا اور ان کی روشنی بھی۔"

سورۂ نسا کی آیت کے الفاظ' انعم اللّٰہ علیھم'، (جن پر اللہ نے اپنا فضل فرمایا) سے واضح ہے کہ یوم حساب کے موقع پر انھیں حساب کتاب کے اضطراب میں ڈالے بغیر کامیابی کی سندِ امتیاز عطا کر کے ان کے لیے جنت کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔

دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہو گا جنھوں نے جانتے بوجھتے حق کا انکار کیا، اپنے پروردگار کے ساتھ سرکشی کا رویہ اختیار کیا، دنیا میں ظلم و عدوان کا بازار گرم رکھا اور اپنی تمام زندگی کو حق کی مخالفت اور باطل کی حمایت کے لیے وقف کر دیا۔ نمرود، فرعون، ابو جہل، ابو لہب اسی گروہ میں شامل ہوں گے:

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ. مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۫ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ.(آلِ عمران۳:۱۹۶-۱۹۷)

"اور ملک کے اندر اِن کافروں کی یہ سرگرمیاں تمھیں کسی مغالطہ میں نہ ڈالیں یہ چند دن کی چاندنی ہے پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیا ہی بری جگہ ہے۔"

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا. اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا.(النساء۴:۱۶۷-۱۶۸)

"جن لوگوں نے کفر کیا اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ان کو تو خدا نہ بخشنے کا ہے، اور نہ جہنم کے سوا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، ان کو کوئی رستہ دکھانے کا ہے۔"

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ان لوگوں کے معاملے میں بھی کسی حساب کتاب کی ضرورت نہیں ہو گی بلکہ وہ اپنے کفر و سرکشی کی خود گواہی دیں گے:

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَتۡھُمۡ رُسُلُنَا یَتَوَفَّوۡنَھُمۡ ۙ قَالُوۡۤا اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ؕ قَالُوۡا ضَلُّوۡا عَنَّا وَشَھِدُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِھِمۡ اَنَّھُمۡ کَانُوۡا کٰفِرِیۡنَ. قَالَ ادۡخُلُوۡا فِیۡۤ اُمَمٍ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ مِّنَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ فِی النَّارِ.(اعراف ۷: ۳۷-۳۸)

”یہاں تک کہ جب ان کے پاس ہمارے فرشتے ان کو قبض کرنے آئیں گے تو ان سے پوچھیں گے کہ اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے تھے کہاں ہیں؟ وہ جواب دیں گے کہ وہ تو سب ہم سے کھوئے گئے اور یہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ لاریب وہ کفر میں رہے۔ حکم ہو گا، جاؤ، پڑو دوزخ میں ان امتوں کے ساتھ جو تم سے پہلے جنوں اور انسانوں میں سے گزریں۔“

تیسرے گروہ میں وہ لوگ شامل ہوں گے جو نہ تو اتنے نیکوکار ہوں گے کہ انبیا، شہدا اور صدیقین کی صف میں کھڑے ہو سکیں اور نہ اس سطح کے گناہ گار ہوں گے کہ انھیں سرکشوں کے گروہ میں کھڑا کیا جائے۔ ان کے اعمالِ صالح اور اعمالِ بد ملے جلے ہوں گے۔ بیشتر انسان اسی گروہ میں شامل ہوں گے۔ یہی وہ لوگ ہوں گے جن کے لیے اصلاً قیامت، یومِ حساب ہو گی۔ ان کے اعمال کو تولا جائے گا جن کے نیک اعمال کا پلڑا بھاری ہو گا انھیں جنت کا انعام ملے گا اور جن کے اعمال کا پلڑا ہلکا ہو گا انھیں دوزخ کی سزا ہو گی:

فَاَمَّا مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِیۡنُہٗ. فَھُوَ فِیۡ عِیۡشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ. وَاَمَّا مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِیۡنُہٗ. فَاُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ.(القارعۃ ۱۰۱: ۶-۹)

”پھر جس کے پلڑے بھاری ہوئے، وہ دل پسند عیش میں ہو گا اور جس کے پلڑے ہلکے ہوئے اس کا ٹھکانا گہری کھائی ہے۔“

قرآنِ مجید نے سورۂ توبہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین میں سے ان تینوں گروہوں کو نمایاں کر دیا ہے:

وَالسّٰبِقُوۡنَ الۡاَوَّلُوۡنَ مِنَ الۡمُھٰجِرِیۡنَ وَالۡاَنۡصَارِ وَالَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡھُمۡ بِاِحۡسَانٍ ۙ رَّضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ وَاَعَدَّ

”اور مہاجرین و انصار میں سے جو سب سے پہلے سبقت کرنے والے ہیں، اور پھر جن لوگوں نے خوبی کے ساتھ ان کی پیروی کی ہے، اللہ ان سے

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ.

راضی ہوا اور وہ ان سے راضی ہوئے۔ اور اس نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں یہ ہمیشہ رہیں گے اور بڑی کامیابی یہی ہے۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ؕ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ ۛؔ مَرَدُوْا عَلَی النِّفَاقِ ۟ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَیْنِ ثُمَّ یُرَدُّوْنَ اِلٰی عَذَابٍ عَظِیْمٍ.

اور تمھارے ارد گرد جو دیہاتی ہیں ان میں منافق ہیں اور مدینہ والوں میں بھی منافق ہیں۔ یہ اپنے نفاق میں منجھ گئے ہیں۔ تم ان کو نہیں جانتے، ہم ان کو جانتے ہیں۔ ہم انھیں دو بار عذاب دیں گے۔ پھر وہ ایک عذابِ عظیم کی طرف دھکیلے جائیں گے۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَیِّئًا ؕ عَسَی اللّٰهُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ.

(۹: ۱۰۰-۱۰۲)

اور کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں جنھوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے، انھوں نے کچھ نیکیاں کچھ بدیاں ساتھ ہی دونوں کمائی ہیں۔ امید ہے کہ اللہ ان پر رحمت کی نظر کرے۔ اللہ غفور رحیم ہے۔''

مندرجہ بالا استدلال کی روشنی میں برزخ کے بارے میں ہمارے نقطۂ نظر کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ برزخ انسان کی موت اور قیامت کی درمیانی کیفیت کی تعبیر ہے۔ انسان مرنے کے بعد قیامت تک اسی عالم میں رہے گا۔

۲۔ اس عالم میں انسانی زندگی کی کیفیت دنیوی اور اخروی زندگی سے مختلف ہو گی۔

۳۔ اس عالم میں انسان کے احساسات، کیفیات اور احوال کے بارے میں ہم حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہ معاملہ امورِ متشابہات میں سے ہے۔ تفہیم مدعا کے لیے اسے عالمِ خواب کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے۔

۴۔ برزخ میں شہدا، انبیا، صدیقین اور صالحین اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور خوش حال ہوں گے۔

۵۔ اس عالم میں رسولوں کے منکرین کو ان کا ٹھکانا صبح و شام دکھایا جائے گا اور اس طرح وہ عذاب کی کیفیت

سے دوچار رہیں گے۔

۶۔ باقی انسان اپنے اعمال کے لحاظ سے اچھی یا بری کیفیت میں ہوں گے۔

۷۔ قیامت کے روز تمام انسان عالمِ برزخ سے نکلیں گے اور جسمانی وجود کے ساتھ زندہ و بیدار ہو کر جزاو سزا کے لیے پیش ہوں گے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سفرنامہ

محمد بلال

میں حاضر ہوں! میں حاضر ہوں!

(۵)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یہاں سے ہم ٹیکسی میں جنت المعلیٰ کی طرف گئے۔ جنت المعلیٰ کیا ہے؟ اس کے بارے میں مولانا وحید الدین کہتے ہیں:

''مکہ جس زمین پر آباد ہے وہ ایک طرف نیچی اور دوسری طرف اونچی ہے۔ نچلے علاقہ کو مسفلہ اور اونچے علاقہ کو معلیٰ کہتے ہیں۔ اونچائی والے علاقہ میں ایک قدیم قبرستان ہے۔ اس کا نام جنت المعلیٰ ہے۔ یہ مکہ سے منیٰ کے رخ پر واقع ہے۔ اس قبرستان میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی قبر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب زادہ ابراہیم اور آپ کی والدہ آمنہ بنت وہب کی قبر ہے۔ آپ کے چچا ابو طالب اور آپ کے دادا عبدالمطلب کی قبریں بھی یہیں ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر جیسا صحابی اور ابو جعفر منصور جیسا حکمران بھی یہیں مدفون ہیں۔..... عرب میں قبوں اور پختہ تعمیرات والے قبرستان نہیں ہوتے۔ وہاں کی قبریں گویا ہموار میدان میں کچھ ابھرے ہوئے نشانات ہوتے ہیں۔..... جنت المعلیٰ عرب کا ایک ایسا ہی قبرستان ہے۔ جنت المعلیٰ ایک ایسا قبرستان ہے جو انسانی اضافوں سے پاک ہے۔ یہاں فطرت کا سادہ ماحول ہے نہ کہ انسان کا بنایا ہوا مصنوعی ماحول۔'' (نثری تقریریں، ص ۱۰۹)

یعنی جنت المعلیٰ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے افراد دفن ہیں۔ ہم جب یہاں پہنچے تو میں نے دیکھا کہ وہاں ہموار بنجر زمین کو چھوٹی چھوٹی چار دیواریوں میں تقسیم کیا ہوا ہے۔ دیواروں پر سفیدی کی ہوئی ہے۔ ہر چار دیواری میں کچھ پتھر پڑے ہوئے ہیں جو قبر کی نشانی کے طور پر رکھے گئے ہیں۔

اس بات کی رہنمائی کہیں سے حاصل نہیں ہو رہی تھی کہ کس شخصیت کی کون سی قبر ہے۔ سعودی حکومت کی جانب سے بھی وہاں ایسی کوئی رہنمائی نہیں تھی۔ شرک اور بدعت کے معاملے میں اس قسم کی حساسیت سمجھ میں نہ آئی۔ وہاں ایک طرف کچھ بنگلہ دیشی ملازم بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے ان سے اس ضمن میں کچھ پوچھا تو انھوں نے کچھ بتانے سے صاف انکار کر دیا۔ وہیں کچھ سیڑھیاں چڑھیں تو اوپر بھی ایک قبرستان موجود تھا۔ شاید وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج، بیٹیوں اور بیٹے کی قبریں تھیں۔ اس قبرستان کے اندر جانا ممکن نہ تھا۔ اس قبرستان کے بند گیٹ کے پاس ایک ایرانی بیٹھا ہوا تھا۔ ہم نے اس سے کچھ سوالات کیے اس نے بڑے مناسب طریقے سے اپنی معلومات کے مطابق جواب دیے۔ اس کے پاس ایک فارسی زبان کا کتابچہ تھا جس میں ان شخصیات کے نام لکھے ہوئے تھے جو وہاں دفن تھیں۔

وقت بہت کم تھا چنانچہ یہاں سے ہم نے حرم کا رخ کیا۔ ٹیکسی لی۔ ٹیکسی والا مقامی سعودی ہی تھا۔ اسے بھی جلدی تھی اس لیے اس نے تیز گاڑی چلائی، جب حرم کے قریب گاڑی پہنچی تو اندر عصر کی جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ ٹیکسی والے کو ہم نے پانچ ریال دینے تھے، مگر ابوبکر کے پاس دس ریال کے نوٹ ہی تھے۔ ٹیکسی والے نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو کہا: ''نماز پڑھیں پیسے بعد میں سہی۔'' ابوبکر کو معلوم تھا کہ حرم میں نماز ادا کرنے کے بعد کسی آدمی کو ڈھونڈنا کس قدر مشکل کام ہے۔ لہٰذا ابوبکر نے اس کی اس فراخ دلی سے خوش ہو کر اسے دس ریال پکڑا دیے۔ پھر ہم حرم کی طرف بڑھ گئے۔

نمازِ عصر ادا کرنے کے بعد ابوبکر نے میرے لیے ایک دکان سے مکہ اور مدینہ کی زیارتوں کی ایک دستاویزی فلم خریدی۔ پھر ہم ہوٹل کی طرف بھاگے۔ گھر والے سامان قریب رکھے ہوٹل کے استقبالیہ میں ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہم نے تیزی سے اپنے حصے کا سامان پکڑا اور جدہ جانے کے لیے باہر نکلے۔ ایک کار نما ٹیکسی والے کے ساتھ معاملہ طے ہوا۔ جب ہم ٹیکسی میں بیٹھ رہے تھے تو ایک بلندی پر تھے، اس وقت میرے بڑے بھائی غلام مصطفیٰ صاحب نے نیچے کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہ وہ قبرستان ہے جہاں عرب زندہ بچیوں کو دفن کر دیا کرتے تھے۔ میں نے فوراً ادھر دیکھا۔ وہ قبرستان بھی ایک بنجر میدان تھا۔ چند پتھر ادھر اُدھر پڑے ہوئے تھے۔ خیال آیا: اسلام نے آ کر بچیوں کو زندہ دفن کرنے کی رسم ہی کو دفن کر دیا۔ اسی لیے ایسے قبرستان مزید نہیں بن پائے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم ٹیکسی میں بیٹھ چکے تھے۔ ڈرائیور کی خواہش تھی کہ روزہ گھر جا کر افطار کیا جائے، اس

لیے ٹیکسی بہت تیزی کے ساتھ جدہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جیسے جیسے میں بیت اللہ سے دور ہو رہا تھا میرے اندر اداسی کی ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ اصل میں چند ''ملاقاتوں'' ہی میں بیت اللہ سے ''انس'' ہو گیا تھا۔

۱۳ دسمبر ۱۹۹۹ کی بات ہے۔ جدہ ہی میں مقیم میرے دوسرے بڑے بھائی انور جلال صاحب کا فون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ پاکستان سے میرا ایک دوست عمرہ کرنے یہاں آیا ہے، اس نے مجھے آج عشا کے بعد صفا کے قریب ملنے کے لیے کہا ہے، اس لیے میں حرم جا رہا ہوں۔ مجھے جب یہ بات معلوم ہوئی تو میرا بھی جی للچانے لگا۔ میں نے انور صاحب سے بات کی اور کہا کہ مجھے بھی ساتھ لے جائیں۔ آپ اپنے دوست کو ملیں، میں وہاں اپنا کام کرتا رہوں گا۔ انھوں نے کہا: ٹھیک ہے۔ شام کو میں اور انور صاحب ٹیکسی کے ذریعے سے جدہ کے اس مقام پر پہنچے جہاں سے حرم جانے والی بسیں اور ٹیکسیاں چلتی ہیں۔ ہم جب وہاں پہنچے تو ٹیکسی ڈرائیور ٹیکسی سے سر باہر نکالے آوازیں لگا رہے تھے: مکہ! مکہ!۔ ہم ایک نوجوان سعودی کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ یہ گاڑی ٹیکسی کی طرح پیلی تو نہیں تھی، عام کار تھی، مگر سعودی ہونے کی وجہ سے وہ بلا تکلف اسے ٹیکسی کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ اس ''ٹیکسی'' میں دو انڈین مسلمان بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے انور صاحب سے کہا: پاکستان اور ہندوستان کے لوگ یہاں اپنے روزگار کے سلسلے میں آئے ہوئے ہیں، مگر یہ لوگ یہاں کے لوگوں کے لیے روزگار کا ذریعہ بھی بن رہے ہیں۔ کیسی دلچسپ بات ہے۔ اس سعودی نے ۱۴۰ کی رفتار سے گاڑی چلائی اور بہت کم وقت میں ہمیں حرم کے سامنے پہنچا دیا۔

جب ہم وہاں پہنچے تو نمازِ تراویح ادا کی جا رہی تھی۔ پہلے ہم نے حرم کے بیرونی صحن میں نمازِ عشا ادا کی۔ پھر ہم اندر گئے اور نمازِ تراویح کی جماعت میں شامل ہو گئے۔ اتفاق سے امام صاحب کے بالکل پیچھے جگہ ملی۔ بیت اللہ کا وہ حصہ ہمارے سامنے تھا جہاں حجرِ اسود نصب تھا۔ جب تراویح کی دو رکعات کے بعد سلام پھیرا تو سامنے بیت اللہ کو پایا۔ بیت اللہ کو دیکھتے ہی ایک کیفیت ضرور مجھ پر طاری ہوتی۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اپنے آپ کو بار بار یقین دلانا پڑتا کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ جب میں اپنے آپ کو یقین دلا لیتا کہ یہ حقیقت ہے تو شکرِ خداوندی کے جذبات کی ایک لہر میرے اندر اٹھتی اور نمی بن کر آنکھوں میں ابھر آتی۔

پروگرام کے مطابق نمازِ تراویح سے فارغ ہونے کے بعد ہم صفا کی جانب بڑھ رہے تھے کہ ایک سپاہی نے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مجھے ہلکا سا دھکا دے کر ایک طرف کیا۔ میں نے سامنے دیکھا تو امام صاحب سپاہیوں کے جلو میں تشریف لا رہے تھے۔ یہ قاری سدیس تھے۔ سپاہی لوگوں کو ان کے راستے سے ہٹا رہے تھے۔ وہ بالکل شاہانہ انداز سے حرم سے باہر نکل رہے تھے۔

جلد ہی انور صاحب کو ان کا دوست مل گیا۔ وہ دونوں حضرات صفا کے قریب ایک جگہ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے اور میں صفا پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اب بھی صفا پر مرد، عورتیں اور بچے بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی وہاں قرآن پڑھ رہا تھا اور کوئی کسی ہموار جگہ پر نماز ادا کر رہا تھا۔ میں اس پر بیٹھ کر سامنے بیت اللہ کی جانب دیکھنے لگا، اور بڑی دیر تک دیکھتا رہا۔

اس کے بعد ہم نے بیت اللہ کا طواف کیا۔ آج بھی بیت اللہ کے اوپر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ حسبِ معمول حطیم لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ملتزم کے ساتھ لوگ چپکے ہوئے تھے۔ حجرِ اسود کو بوسہ دینے والوں کی قطاریں بنی ہوئی تھیں۔ حجرِ اسود کے پاس کھڑا سپاہی بڑی جاں فشانی سے اپنے فرائض ادا کر رہا تھا۔ وہ بوسہ دینے والوں کو تیزی سی آگے بڑھنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اگر کوئی بوسہ دینے والا بزرگ ہو یا تیزی سے کام نہ لے تو سپاہی اسے کندھے سے پکڑ کر آگے دھکیل دیتا تھا۔ شاید ان سپاہیوں کو معلوم نہیں تھا کہ انسان کی عزت بیت اللہ سے بڑھ کر ہے۔

طواف کے بعد ہم باہر آ گئے۔ رات کے دو بج چکے تھے، مگر باہر اتنی رونق تھی جیسی ہمارے ہاں رات ۸ بجے کسی بڑے بازار میں ہوتی ہے۔ پھر ہم ایک بس میں بیٹھے اور سحری سے پہلے جدہ اپنے گھر پہنچ گئے۔

پاکستان آ کر جب میں بیت اللہ سے متعلق اپنے تاثرات بیان کر رہا تھا تو میرے ایک کزن منظور محمد نے کہا: لوگ کہتے ہیں کہ جنھوں نے یہ مقامات نہیں دیکھے، وہ انھیں دیکھنے کو ترستے ہیں اور جو لوگ ان مقامات کو دیکھ لیتے ہیں وہ انھیں دوبارہ دیکھنے کے لیے تڑپتے ہیں۔ میں نے کہا: بالکل صحیح۔ آج میں واقعی ان مقامات کو دوبارہ دیکھنے کے لیے اپنے اندر ایک تڑپ محسوس کرتا ہوں۔

لب دعا گو ہیں کہ عالم کا پروردگار اب حج کے موقع پر بیت اللہ کو دیکھنے اور اس کا طواف کرنے، حجرِ اسود کو چھونے اور اس کا بوسہ لینے، آبِ زم زم پینے اور صفا و مروہ کے مابین سعی کرنے کی استطاعت اور توفیق عطا فرمائے۔

خیال و خامہ

جاوید

O

نوا پیرا ہوں شاید اِس سے تیرا دل بدل جائے
مرے نغموں سے یہ آشفتۂ محمل بدل جائے

تری موجِ نفس میں وہ تلاطم چاہیے جس سے
یہ رسمِ اختلاطِ موجہ و ساحل بدل جائے

بڑی مشکل سے دو صدیوں کا اندازِ سفر بدلا
تمنّا تھی ، اگرچہ جادہ و منزل بدل جائے

مرے اشکوں نے سینچی ہے یہ کشتِ آرزو تیری
عجب کیا ہے اگر اِس سے ترا حاصل بدل جائے

بھروسا چاہیے اُس پر کہ اُس کی پادشاہی میں
نہیں ممکن کہ آئینِ حق و باطل بدل جائے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com